ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا

حصہ سوم

ین وقت کے بعض موجودہ مسائل کا حدیثی روشنی میں حل پیش کرنیکی منصفانہ سعی کی گئی ھ

از تالیف

حضرت مولانا سید محمد بدر عالم صاحب مدظلہ

نزیل مدینہ منورہ

طبع اول سنہ ۱۳۸۳ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

محترم حضرت مولانا سید محمد بدر عالم صاحب میرٹھی ثم المدنی مدظلہ العالی کی ذات بابرکات محتاج تعارف نہیں، اور انکی تالیفات پر تقریظ لکھنا میری حیثیت سے بالاتر ہے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جوامع الکلم پر مشتمل ان کی یہ سلک مروارید جو حقیقتاً "جواہر الحکم" اور عبادات، معاملات اور معاشرات کے اصول کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے خواص وعوام حکام ورعایا سب کیلئے یکساں مفید ہونے کی وجہ سے اسکی طرف توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں اور قارئین کرام سے التماس کرتا ہوں کہ اس کو نہایت غور سے پڑھ کر عمل پیرا ہوں۔

حضرت مولانا مدظلہٗ نے بستر علالت پر لیٹ کر جبکہ ان میں کروٹ بدلنے کی بھی طاقت نہیں تھی مختلف اوقات میں مختلف اشخاص سے اس کو املاء کرایا اور پھر نہ اس کو دیکھ سکے اور نہ سن سکے اور اسی غیر صاف شدہ مسودہ پر سے اس کمترین نے کتابت کرائی۔

حضرت مولانا عربی کے ماہر اور یہ کمترین ناقص در ناقص اور

پھر حالت یہ کہ مسودہ میں کوئی لفظ یا عبارت سمجھ میں نہ آئے تو اتنا دور رہونے کی وجہ سے نہ کاتب سے دریافت کرنے کی کوئی صورت اور نہ حضرت مولانا سے مراجعت کا کوئی موقعہ اسلئے اسکی کتابت وغیرہ کے اغلاط کو اس خاکسار کا قصور سمجھیں۔

نیز چھاپنے کی مشین چونکہ نئی تھی اور اسٹنسل پر کتابت بھی معمولی اسٹنسل کی کتابت سے جداگانہ جس کی ناتجربہ کاری کی وجہ سے کہیں کہیں نقطے وغیرہ صاف نہیں نکلے لہٰذا قارئینِ کرام خود اس کو درست کرلیں اب اسی کے مطابق کتاب طبع ہو رہی ہے۔

بفحوائے اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ حضرت مولانا مدظلہ، نے نہایت خلوص اور دلسوزی کے ساتھ امت مرحومہ کی خیر خواہی فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو مقبول گردانے اور حضرت مولانا کو شفاء کلی بخش کران جواہر الحکم حدیثی سلسلہ میں اضافہ فرماکر اُمت مرحومہ کی اصلاح کا ذریعہ بناتا رہے۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

احقر محمد ابراھیم سنجانوی عفی عنہ
خادم جمعیۃ علماء ٹرانسوال، جوہانس برگ جنوبی افریقہ

شکریہ

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

محترم حضرت مولانا سید محمد بدر عالم صاحب مدظلہ العالی نے اپنی بیماری ضعف ونقاہت کی حالت میں باوجود صاحب فراش ہونے کے نہایت خلوص اور دلسوزی کے ساتھ رسالہ "جواہر الحکم" حصہ سوم تالیف کر کے جمعیۃ علماء ٹرانسوال کو اس کے سائکلوسٹائل کرانے کی خدمت سپرد فرما کر احسان فرمایا۔ جزاہ اللہ فی الدارین خیرا۔

ارکان جمعیۃ علماء ٹرانسوال حضرت مولانا مدظلہ کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں اور اس کی اشاعت کو اپنی سعادت یقین کرتے ہیں۔

مسلمان بھائیوں اور بہنوں کو اپیل کرتے ہیں کہ اس کو غور سے پڑھیں اور اس پر عمل کر کے سعادت دارین حاصل کریں۔ فقط وما علینا الا البلاغ

۲۳ جمادی الاخریٰ ۱۳۸۲ھ　　　　جمعیۃ علماء ٹرانسوال

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ باری النسم والصلوٰۃ والسلام علیٰ
من خص بجوامع الکلم وجواھر الحکم وعلیٰ اٰلہ
واصحابہ خیر الامم

ایک اہم اور قابلِ توجہ گذارش

اس مختصر رسالہ کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ جن ناواقف
اصحاب کو اسلام کی طرف سے بے وجہ اور بے دلیل یہ
غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے کہ اسلام میں صرف مابعد الموت
یا ہماری معاد کا حل ہے اور ہمارے موجودہ مسائل کے
لئے اس میں کوئی روشنی نہیں۔ ان کو ان چند احادیث
اور مختصر اشارات سے جو کہیں کہیں حدیثوں کی تشریح
کے دوران میں آ گئے ہیں یہ معلوم ہو جائے کہ اسلام نے
اجتماعی مسائل کو کتنی اہمیت کے ساتھ حل کیا ہے اور

ان کو کس طرح آسانی سے سُلجھا کر رکھ دیا ہے۔

اب یہ فرض آپ کا ہے کہ ان ٹھوس باتوں کو اپنے جدید اصطلاحی الفاظ میں ترتیب دے کر اس سے فائدہ اٹھائیں۔ مؤلفِ ضعیف اُن تفصیلات کے لئے کتنا بے چین و مضطرب ہے اس کو یورپ زدہ کیا جانیں اس کو وہی سمجھ سکے گا جس کو یہ یقین اور عین الیقین ہو کہ یہ دین کامل دین ہے، آخر اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ (آج میں پورا کر چکا تمہارے لئے دین تمہارا) (پارہ ۶ رکوع ۵) کے کچھ معنیٰ ہیں یا نہیں۔ یہ چند سطریں بطورِ نمونہ مشتے از خروارے پیش کی جارہی ہیں۔ آپ جس طرح غور کے ساتھ انگریزی کی تعلیمات دیکھا کرتے ہیں ذرا تھوڑے حسن ظن کے ساتھ خدارا ان پر بھی تو غور فرمائیے اور انصاف کریئے کہ آپ کے دین میں وہ کونسا گوشۂ زندگی باقی ہے جس پر بحث نہیں کی گئی

جواھر الحکم کے دونوں حصوں میں اُس بات کی رعایت کی گئی ہے کہ دین کے وہ بہت سے اہم گوشے جو نہ صرف عملی طور پر معطل ہو چکے ہیں بلکہ ہمارے

دماغوں سے بھی نکل چکے ہیں اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے برعکس خلاف شرع امور اور بدعملی ہمارے ماحول میں اس درجہ سرایت کر چکی ہے کہ اب اس سے بچنا گویا ناممکن سا معلوم ہوتا ہے اس لئے میں اپنے مسلمان بھائیوں کی خدمت میں بہت خیر خواہی اور دردمندی سے عرض کرتا ہوں کہ وہ ہر ہر حدیث کو بار بار اور بہت غور کے ساتھ ملاحظہ فرمائیں اور اپنی زندگی کے بگڑے ہوئے شعبوں کی اُن احادیث کی روشنی میں اصلاح کا تیز قدم اٹھائیں اور صرف علمی بحثوں میں اُلجھ کر اور کٹ حجتی میں پڑ کر ان جواہرات کی قدر دانی سے محروم نہ رہیں۔ علام الغیوب کی جانب سے انسانیت کی اصلاح کے جو علوم انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی معرفت آتے رہے ہیں اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اس کی بہت مکمل اور آخری قسط آ چکی ہے :۔ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ ؕ (اب کس بات پر اُس کے بعد یقین لائیں گے) (پارہ ۲۹ رکوع ۲۲) اس لئے اہواء نفسانیہ اور اپنی عقولِ ناقصہ کی پرواز کی حد پہچان کر یہ اُمید منقطع

کر دیں کہ آپ کی فلاح و بہبود کا اس سے بہتر کوئی اور راستہ آئندہ نکل سکتا ہے اور یہ تو سودائے خام ہے کہ اس مکمل آئین میں کسی ادنیٰ ترمیم کا خیال دماغوں میں لائیں۔

دنیوی ترقیات کا دروازہ یقیناً کھلا ہوا ہے اور ہمیشہ کھلا رہے گا لیکن اس ذات کی قسم کہ جس نے زمین اور آسمان کو بنایا اور اس کا ایک آئین بھی خود ہی بنا دیا ہے کہ اب دین میں کسی جدّت کی تو کیا ایک چھوٹا سا نقطہ بھی رکھنے کی گنجائش باقی نہیں ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ ہم اپنی غفلت اور دینی جہالتوں کے باعث ان سہولتوں اور وسعتوں سے فائدہ اٹھانا تو درکنار ان کو دیکھے بغیر محض اپنی جسارت سے دِین میں تنگی اور شدت کا فیصلہ کر ڈالتے ہیں۔

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ط مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ط اور نہیں رکھی تم پر دین میں کچھ مشکل، دین تمہارے باپ ابراہیم کا (پارہ ۱۷، رکوع ۱۷)

رسالہ کے ملاحظہ فرمانے سے قبل ناظرین کرام کی خدمت میں یہ التماس کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف کا

تعلق نہ کسی جماعت کے ساتھ ہے نہ کسی خاص شخصیت سے اس کا تعارف ہے، وہ مدتوں سے عالمِ گمنامی میں پڑا ہوا اپنی حیاتِ مستعار کے دن پورے کر رہا ہے اس لئے اس رسالہ کو زبردستی کسی کی طرف اشارہ سمجھنے یا کسی پر چسپاں کرنے کی کوشش نہ کی جائے بلکہ عالمِ اسلامی کا عام انتشار دیکھ کر ایک زخم خوردہ دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ اپنے مسلمانوں کے سامنے چند اشکہائے غم حقیر الفاظ کی شکل میں بہادے تاکہ اگر ان کو اس مختصر عرضداشت سے کوئی صحیح راستہ کا سراغ ہاتھ نہ لگ سکے تو کم از کم میرا دل تو کچھ ٹھنڈا ہو جائے۔

مقصود عرضداشت سے اظہارِ حال ہے
ہر گز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

اب اس کے بعد آپ کو اختیار ہے کہ اس عرضداشت کو قبول فرمائیں یا نہ فرمائیں لیکن خدارا اس دورِ اختلاف میں کسی اور نئے اختلاف کا اکھاڑا نہ بنائیں۔

یہ بات بھی ملحوظ رکھنی ضروری ہے کہ یہ صرف اسلامی چند اہم ضرورتوں کے حدیثی روشنی میں حل کا ایک نمونہ ہے

اور وہ بھی حدیث کی ایک ایسی مختصر کتاب سے چن کر پیش کیا گیا ہے جس میں بڑی کتابوں کے طویل طویل بابوں میں سے چند احادیث کا انتخاب کیا گیا ہے. میں نے اس رسالہ میں اس مختصر انتخاب کے استیعاب کا بھی ارادہ نہیں کیا بلکہ اس میں سے بھی صرف نمونہ کے طور پر ایک ایک دو دو حدیث چن لی ہیں لہٰذا اس کو یہ سمجھ لینا کہ یہ اسلامی آئین کے متعلق کوئی مستقل اور مستوعب تصنیف ہے صحیح نہیں ہے اور نہ مؤلف اپنی سہ سالہ مسلسل علالت کے بعد استیعاب کا ارادہ کر سکتا ہے یہ سطور بستر علالت پر لیٹ کر بطور املا لکھوا دی ہیں۔ تاکہ ناظرین کو نمونتہً یہ اندازہ ہو سکے کہ کتب فقہ اور فتاوائے صحابہ اور اسلامی ججوں کے فیصلوں کو چھوڑ کر صرف حدیثی روشنی میں ہماری موجودہ مشکلات کا حل موجود ہے یا نہیں۔

آمدم بر سر مطلب۔ اب سوال یہ ہے کہ اس ترقی یافتہ دور میں کیا اسلام پر عمل کرنا کچھ مشکل ہے؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں. اس کے بعد یہ حقیقت واضح کر دینا ضروری ہے کہ اسلامی

آئین کی راہ میں جو مشکلات بھی اس وقت نظر آرہی ہیں
ان کا بڑا سبب ہماری تعلیم، ہماری معاشرت اور ہمارے
دماغوں کی ساخت کی تبدیلی ہے، انگریزی دورِ حکومت
نے ہماری عربی اور انگریزی درسگاہوں کو ایسا برباد
کیا اور ایسے لایعنی اختلافات میں پھانس دیا کہ جو عربی
خواں تھے ان کو اپنی گزشتہ صدیوں کے دور حکومت
کے اندرونی و بیرونی نظام کے مطالعہ کا خیال نہ گذر سکا۔
عہدِ صحابہ کے قضایا اور اسلامی حکومت کی عدالتوں کا نظام
ان کے فاضل ججوں کے فیصلوں پر گہری نظریں ڈالنے
کے بجائے ہم کو جزئی اختلافات میں پھانس دیا، مُلکی
سیاست اور دوسرے ممالک سے اپنے تعلقات کی
نوعیت اور دوسرے امور کی طرف اسلامی نظریہ سے جائزہ
لینے کا کبھی ان کو موقع نہ دیا پھر جن شاذ افراد کو اس طرف
توجہ کرتے دیکھا ان میں سے کسی کو جلاوطن کر دیا اور
کسی کو طرح طرح سے بدنام کر دیا حتیٰ کہ ان کی تصانیف
سے بھی ہم کو اتنا محروم کر دیا کہ مشکل سے چیدہ چیدہ
کچھ افراد ہی نکلیں گے جنہوں نے اس نظریہ سے کچھ دلچسپی

کے ساتھ ان کا مطالعہ کیا ہوگا، اب انگریزی درسگاہوں
کی طرف توجہ فرمائیے تو ان کو اس طرح برباد کیا کہ ہمارے
دماغوں میں انگریز کی خدمت وعظمت اور ان کے
خطابات کی ہوس کے سوا کوئی نصب العین ہی باقی
نہ چھوڑا، اپنی اسلامی روایات کا زندہ کرنا تو درکنار
اس کے برعکس ان سے اتنی نفرت دلوں میں پیدا کردی
کہ اکل طعام وشراب، شراب کے طریقے، لباس کی وضع قطع
حتیٰ کہ معاشرہ کے ایک ایک گوشہ میں ان ہی کی تہذیب
زندہ کرنے میں ہم اپنی ترقی کا راز مضمر سمجھنے لگے سی۔آئی
ڈی کے محکمے مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے انگریزی افسران
بلکہ انگریزوں کے تمام محکموں کے چلانے کی تمام مشینریاں
ان ہی درسگاہوں سے تیار ہوئیں، پھر ہمارے قانونی دماغوں
کو جس قانون سے واسطہ پڑتا رہا وہ یہی انگریزی قانون
تھا اس لئے اسی کا مطالعہ کرنا ناگزیر ہوگیا اور انہیں
علمی سرگرمیوں نے ہمارے دماغوں کی ساخت اتنی
بدل ڈالی کہ اب جو قانون ان کے قانون سے مِلتا جُلتا
تھا وہ ہمارے دماغوں کے لئے بے دلیل قابلِ تسلیم تھا

اور جو اس کے ذرا خلاف ہوتا وہ بے دلیل ہمارے لئے
ناقابلِ فہم تھا، رہا اسلامی قانون تو اول تو عربی سے
ناواقفیت کی بدولت اس کے مطالعہ کرنے کی نوبت
ہی کب آسکتی تھی بلکہ جب مختلف انگریزی قانون کے
مطالعہ اور انگریزی عدالتوں میں کھڑے ہو کر اسی کے
مطابق پیروی کرنے میں عمر بسر ہو گئی تو اب ہمارے دماغوں
میں اسلامی قانون کے نظریات سمجھنے کی استعداد ہی
کیا باقی رہ سکتی تھی آج بھی یہ تجربہ ہے کہ وکلاء میں جو
وکیل فوجداری کا کام زیادہ کرتا ہے آخر میں اس کا دماغ
دیوانی مقدمات میں زیادہ نہیں چلتا اسی طرح اس کے
برعکس ہے۔

یہ فرق کیوں پیدا ہوا کیا اسی لئے نہیں کہ ایک طویل
مشّاقی کے بعد انسانی غور و فکر کا زاویۂ نظر ہی ایک خاص
دائرہ میں محدود ہو کر رہ جاتا ہے اور اس سے باہر وہ
نکلنا چاہے بھی تو نکل نہیں سکتا ہے خواہ اس کو اپنی اس
خامی کا خود شعور ہو یا نہ ہو، اس کے علاوہ جو ایک عمیق
عیاری انگریزوں نے کی وہ یہ کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور

علماء کے مابین نفرت کی اتنی بڑی خلیج حائل کر دی کہ اسکی
وجہ سے ایک دوسرے کے کبھی قریب آہی نہ سکا، اسلئے
سیاست و مذہب کے دو ٹکڑے ہو گئے اور ایک دوسرے
سے اتنے بعید ہو گئے کہ کبھی اجتماعی طور پر ہم کو اسلامی آئین
کے لئے مل جُل کر غور کرنے کا موقعہ ملنا ہی ناممکن ہو گیا،
پھر جب ہم کو آزادی ملی تو ایسی حالت میں ملی کہ ہمارے
دماغ ان مسموم اثرات سے اتنے متاثر ہو چکے تھے کہ مذہب و
وطن کے ایک رشتہ میں منسلک ہونے کے باوجود ہم ایک
دوسرے سے اتنے بدگمان رہے کہ اب ہر جماعت کو اپنی
کامیابی کا راز دوسری جماعت کی شکست میں نظر آنے لگا،
اور یہی نظریہ ابھی تک کارفرما ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ
اس لئے موجودہ زمانے میں اسلامی آئین میں اگر کوئی
دشواری ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ جو تعلیم یافتہ دماغ
سالہا سال سے انگریزی کا مطالعہ کرتے کرتے اب تھک
چکے ہیں ان کے پاس اتنی فرصت کہاں ہے کہ وہ از سرِ نو
پھر اتنی ہی محنت اٹھائیں کہ اسلامی قوانین سے براہِ راست
پورے طور پر استفادہ کرنے کی صلاحیت پیدا کر سکیں

ان کیلئے اب دو ہی راہیں تھیں یا اسلامی قوانین کا انگریزی تراجم کے ذریعہ سے مطالعہ کریں یا ایسے علماء سے مشورہ طلب کریں جو کسی علمی یا انسانی کمزوری کی وجہ سے ان کی ہمنوائی کرنے پر مجبور ہوں۔

اب سوال یہ ہے کہ آئندہ اس کا کوئی حل ہے بھی یا نہیں تو جواب کھلا ہے کہ سب سے پہلے تو عربی اور انگریزی درسگاہوں اور اہلِ علم میں جو منافرت وعداوت قائم ہو چکی ہے اس کے دور کرنے کی پوری جدوجہد کی جائے اور یہ فیصلہ کر کے کی جائے کہ اسلامی قوانین کو انگریزی سائنس کے سامنے جھکانا ہے یا اسلامی قانون کے اندر رہ کر جدید ترقیات سے استفادہ کرنا ہے، یہ ظاہر ہے کہ یہ بگڑا ہوا نقشہ چند مہینوں یا سالوں میں تبدیل نہیں ہو سکتا کیونکہ عملی اختلاف اب عقائد کی جگہ حاصل کر چکا ہے اس لئے جانبین کو اپنی اپنی جگہ سے ہٹنا ایک پہاڑ نظر آنے لگا، بالخصوص جبکہ علمی روشنی کے ساتھ خواہ وہ کفر کے قوانین ہوں ہم کو ظاہری شان وشوکت بھی حاصل ہو اس لئے ایک طرف کچھ ہم کو تنزّل کرنا ہوگا دوسری طرف صحیح علماء

کو دوسرے مشاغل سے الگ ہو کر کچھ ترقی کرنی ہو گی اور
اسلامی تاریخ کا تفصیلی جائزہ لینا ہو گا جس میں احادیث
وصحابہ اور عہد سلف کے فیصلے خلفاء کے زمانہ کا نظامِ
حکومت پھر درجہ بدرجہ ہر دور کے اکابر اور فاضل ججوں
کا طرز عدالت یہ سب اشیاء اس وقت تصانیف کی شکل میں
موجود ہیں اور متاخرین میں سے اس پر حافظ ابن تیمیہؒ
اور شاہ ولی اللہؒ اور شاہ اسمٰعیلؒ کی تصنیفات اور
خاص طور پر مقدمہ ابن خلدون وغیرہ وغیرہ کتب کا پورے
غور وفہم کے ساتھ مطالعہ کرنا ضروری ہو گا۔

اسی کے ساتھ ساتھ اگر جدید تعلیم یافتہ جو دینی اور مذہبی
خیال رکھنے والے ہیں وہ تھوڑا سا وقت عربی کے ایک مختصر
کورس کے پڑھنے میں صرف کریں جو میرے نزدیک چار سال
سے زیادہ کا نہ ہو گا مگر اس میں یہ رعایت رکھنی لازمی ہے
کہ وہ کورس اتنا ٹھوس ہونا چاہئے جس کا نتیجہ بھی ٹھوس
نکل سکے نیم ملّا جو بھی ہو گا وہ خطرۂ ایمان ثابت ہو کر رہیگا
یہ بحث تو ایک اصولی ہے لیکن یہاں ایک غلط فہمی کا دور
کردینا بھی اصولاً ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے دماغوں

ہیں بے وجہ یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ مذہب اور سائنس پر بہ یک وقت عمل پیرا ہونا مشکل ہے حالانکہ ان دونوں میں ٹکراؤ کا کہیں موقع ہی نہیں، سائنس جدید کی ترقیات کا عام تعلق عالم مادیات سے ہے جس میں مذہب کہیں حائل نہیں ہوتا اور اگر کسی شعبہ میں معمولی سا تصادم نظر آئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ سائنس کا اقتضا نہیں آپ کی خواہشات کا تقاضا ہے، اس لئے سائنس اور جدید خواہشات کے تقاضوں میں اگر آپ فرق ملحوظ رکھیں تو اسلامی قانون کی طرف سے بدگمانیوں کا دروازہ خود بخود بند ہو جائیگا۔

اس کے بعد میرا خیال تھا کہ میں اسلامی نظریہ کے مطابق چند اہم نکات اور پیش کرتا جو اسلامی آئین کی ترتیب میں بڑی حد تک روشنی کا موجب ہو سکتے تھے لیکن جب یہ دیکھا کہ اگر ان کو اجمالی شکل میں بھی پیش کیا جاتا ہے تو یہ مختصر تمہید بھی ایک مستقل رسالہ کی شکل اختیار کر لے گی، اس لئے اپنے قلم کو اس حد پر روک کر صرف بہت دردمندانہ اور مخلصانہ طریقہ پر اتنی عرضداشت پیش کرنی ضروری سمجھتا ہوں کہ قانون جو بھی بنے لیکن جب

تک وہ صحیح معنٰی میں اسلامی قانون نہ ہو بلکہ انگریزی قوانین
کا صرف ایک چربہ ہو اس کا نام اسلامی قانون نہ رکھا
جائے اور اس درمیان میں اسلامی عہد کے قوانین بالخصوص
سلطان عالمگیرؒ جس کو انگریزی تاریخ بھی (EMPERoR
AURANGZEB THE GREAT) کہہ کر یاد کرتی ہے۔ کم سے کم
انہیں کے دور کے قوانین کا مطالعہ جاری رکھا جائے اور
اگر موجودہ ترقی یافتہ دماغ انمیں کوئی روشنی محسوس کرے
تو ان سے استفادہ کی کوشش ضرور جاری رکھے، میں نے
احادیث اور قضایا صحابہ اور دور اول کے فاضل ججوں
کے فیصلوں کی طرف ابھی اس لئے توجہ نہیں دلائی کیونکہ
پہلے ہی قدم میں ہمارے دماغوں میں ان کے مطالعہ
اور فہم کی استعداد پیدا ہونی مشکل ہے اس لئے اگر ہم
آہستہ آہستہ قدم اٹھائیں گے تو ہمارے دماغوں میں ممکن
ہے کہ قدرت یہ جذبہ پیدا کر دے کہ ہم کو ان متقدمین
اصحاب کے مرتب کردہ آئین وضوابط دیکھنے کا خود بخود
شوق پیدا ہو جائے اور اس راستہ سے ہم صحیح اسلامی آئین
سمجھنے کی استعداد اور اسکے نفاذ کے طریقے اور اس کے

منافع محسوس کرنے پر مجبور ہو جائیں، اگر ایسا نہ کیا گیا، اور خود تراشیدہ آئین کا نام اسلامی آئین رکھ دیا گیا تو صرف یہی نہیں کہ یہ خلافِ واقعہ ہوگا بلکہ ایک اخلاقی اور مذہبی جرم بھی ہوگا اور جب کبھی مسلمانوں کو آئندہ دَور میں اسلامی تاریخ کے صحیح مطالعہ کا موقع ملے گا تو انکو یہ مغالطہ بجا طور سے لگ سکتا ہے کہ شاید اسلام بھی مختلف زمانوں میں مختلف مصالح کے پیشِ نظر سانپ کی طرح کینچلی بدلتا چلا آیا ہے جس کا دنیا میں درحقیقت نہ کوئی نصب العین تھا اور نہ کوئی حقیقی وجود تھا بس جس دور میں مسلمانوں نے کسی آئین کا نام اسلامی آئین رکھ لیا اس کی حقیقت صرف اتنی ہی تھی اور بس۔

یہ میری ایک بہت ہمدردانہ گذارش ہے اس میں نہ کسی خاص شخص پر نکتہ چینی مقصود ہے اور نہ کسی پارٹی کی ترجمانی کرنی منظور ہے کیونکہ احقر کے نزدیک ان چالبازیوں سے علم کا کوئی تعلق نہیں۔

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں اس رسالہ کے عنوانات کی ایک اجمالی فہرست آپ کے سامنے پیش

کر دوں، میں نے اپنے دور میں انسان کے خون کی قیمت
کی جو ارزانی دیکھی اس سے میرے دل کو اتنا دُکھ ہوا کہ
میں نے یہ ضرورت محسوس کی کہ میں سب سے پہلے اسلامی نظریہ
سے انسان کی قیمت کی اہمیت بیان کروں اس کے بعد
مجھ کو ہماری اپنی موجودہ بربادی کا جو سب سے بڑا سبب
معلوم ہوا وہ یہ ہے کہ ہمارے دلوں میں اُنس اور محبت،
اغماض اور حسن ظنی کی بجائے بغض اور عداوت، بدگمانی
اور بے وجہ جھگڑے پیدا کرنے کی خصلت پیدا ہو چکی ہے،
اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ میں اس حقیقت کو واضح کر دوں
کہ اسلامی نظریہ سے اُنس و محبّت صرف مسلمانوں کے
مابین نہیں بلکہ جملہ مخلوق کے ساتھ یہ تعلق رکھنا ایک
بنیادی حیثیت رکھتا ہے، اس کے بعد چند عنوانات حاکم
اور محکوم کے باہمی تعلقات اور ان کے چند فرائض کے متعلق
ہیں پھر چند ایسی فلسفیانہ نصائح درج کی گئی ہیں جو دیکھنے
میں بہت سطحی نظر آتی ہیں مگر ان کے اثرات بہت عمیق
اور گہرے ہیں۔ رسالہ کے خاتمہ پر صرف ایک حدیث صحابہ کرام
کے متعلق لکھی گئی ہے کیونکہ دین انہی کے واسطے سے ہمکو پہنچا

اس لئے اگر ان کا صحیح تعارف نہ کرایا جائے تو یہ رسالہ یقیناً نامکمل رہے گا۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣعَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ؁

(ترجمہ: کہہ دے یہ میری راہ ہے بُلاتا ہُوں اللہ کی طرف سمجھ بُوجھ کر میں اور جو میرے ساتھ ہے اور اللہ پاک ہے اور میں نہیں شریک بنانے والوں میں) (پارہ ۱۳ رکوع ۶)

میرا علم ناقص در ناقص ہے اور دماغ بھی غیر حاضر ہے اس لئے آپ صرف ان پیش کردہ احادیث کے "انمول موتیوں" سے بے کھٹکے اپنا دامن بھر لیں اور تشریحات میں جو سُقم نظر آئے اس کو احقر کا قصور علم تصور فرمائیں۔

میں اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہُوں کہ وہ اِن چند اوراق کو مسلمانوں کی اصلاح کا ذریعہ کر دے اور میری مغفرت کا ایک بہانہ بنا دے ؎

وذلك فی ذات الالہ وان یشاء

یبارك علی اوصال شلو ممزع

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا
مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَسَلَّمَ

(نوٹ) یہ حکومت اسلامیہ کے متعلق چند احادیث کا ترجمہ ہے، مختصر تشریحات کے ساتھ اس کا نام آئین اسلام رکھنا صحیح نہیں اور وہ بھی ایسی غیر ذمہ دارانہ حالت میں لکھا گیا ہے کہ مصنف بستر علالت پر پڑا ہوا ہے اور اس کو دوبارہ سننے کی ہمت بھی نہیں ہے۔

طالبینِ حق کو چاہیئے کہ وہ تعبیری اصلاحات خود فرمالیں اور اصل مقصد کو سمجھنے میں بے وجہ نہ اُلجھیں۔

فقط والسّلام

بندہ محمد بدر عالم غفرلہٗ
المدینۃ المنورہ
۳ رذی الحجۃ الحرام ۱۳۸۲ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

حَامِدًا وَّ مُصَلِّیًا وَّ مُسَلِّمًا

انسان بڑی مشکل سے کامل انسان بنتا ہے اسکو ضائع کر دینا صرف اپنی قوم کا نقصان نہیں بلکہ عالم انسانیت کا نقصان ہے

(۱) عَنِ ابۡنِ عُمَرَ رضؓ قَالَ قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ اِنَّمَا النَّاسُ کَالۡاِبِلِ الۡمِائَۃِ، لَا تَکَادُ تَجِدُ فِیۡھَا رَاحِلَۃً متفق علیہ مشکوٰۃ ص ۴۵۸

ترجمہ: حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے سَو اونٹ کہ ان میں سواری کے لئے سانڈنی بمشکل ایک ملتی ہے (بقیہ سب لدّو ہوتے ہیں یعنی بوجھ اٹھانے کے کام کے)

شرح: تاریخ اس پر شاہد ہے کہ اسلام سے قبل انسان کی کوئی قیمت نہ تھی، جنگ وجدل، آبرو ریزی وخوں ریزی

یہی ان کے قابلِ فخر اور مایۂ ناز کارنامے تھے، انکے نزدیک کسی قابل قدر انسان کو ذرا سی بات پر قتل کر ڈالنا یہی انکی بڑی قدر دانی تھی، چنانچہ خوشی اور میلوں میں جب کبھی وہ اپنے فخریہ کارنامے بیان کرتے تو انہی انسانیت سوز حرکات کا تذکرہ کیا کرتے تھے، رہ گئی غریب عورت تو اس کا تو وجود ہی ان کے عقیدہ میں باعثِ ننگ و عار تھا، حتیٰ کہ ایک مشفق باپ اپنی لختِ جگر لڑکی کو اپنے ہاتھوں اسی لئے جب تک زندہ درگور نہ کر لیتا اس وقت تک اطمینان کے سانس نہ لیتا تھا لیکن جب اِسلام آیا تو اس نے انسان کو انسان کی قیمت سے پہلی بار روشناس کرایا۔

اب ذرا سوچئے کہ ماحول کیا ہے اور مسئلہ کتنا کٹھن ہے، لیکن آنحضرتؐ کا طرزِ تفہیم کتنا مؤثر اور دلوں میں اُتر جانیوالا تھا یعنی یہ کہ تم اونٹ کی قیمت تو جانتے ہی ہو اس پر کبھی کبھی ذرا سی دیر میں قبیلے کے قبیلے کٹ مرتے ہیں، پھر ان میں سانڈنی کی قیمت جاننے والا تم سے بڑھ کر اور کون ہوگا۔ سن لو کہ عام انسان عام اونٹوں سے کم نہیں، اور جو ان میں لائق افراد ہیں وہ ایک سانڈنی کی قیمت سے

کم نہیں، جس طرح ایک سانڈنی سینکڑوں اونٹوں میں مشکل دستیاب ہوتی ہے اسی طرح ایک لائق انسان کہیں مدتوں میں جاکر لائق بنتا ہے اس کی قدر دانی کرنی انسانیت کا شرف ہے اور ذراسی بات پر اس کو قتل کر ڈالنا یہ شرف نہیں انسانیت پر بڑا داغ ہے۔

ایک مرتبہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے دریافت کیا گیا کہ سب سے بہتر انسان کون ہے، آپ نے جو جواب اس کا ارشاد فرمایا، وہ گو بہت سادہ تھا مگر بڑا فلسفیانہ بھی تھا مختصر الفاظ میں آپ کے جواب کا حاصل یہ تھا کہ انسانوں کی مثال ایسی ہی ہے جیسے سونے چاندی کی کانوں کی، عمدہ کان سے جو سونا برآمد ہوتا ہے صاف ہونے کے بعد وہی بڑھیا کہلاتا ہے اور اسی طرح اس کا عکس، تم اسی پر انسانوں کو قیاس کر لو کہ اسلام میں سب سے زیادہ بہتر وہی ہے جو زمانۂ کفر میں تم میں سب سے بہتر شمار ہوتا تھا، اسی لئے آپ کی دعا یہ تھی کہ الٰہی اسلام کو عزت دے یا عمر کو اسلام کی توفیق بخش کر یا ابوجہل کو، اب آگے یہ کام قدرت کا تھا کہ وہ اس سعادت کے لئے کس کا انتخاب کرتی ہے۔

پھر اس کے بعد عنقریب ہی وہ دعا حضرت عمرؓ کیلئے مستجاب ہوئی اور سب کو معلوم ہے کہ اسکے بعد فوراً اسلام کے ضعف و ناتوانی کا نقشہ کتنا جلد قوت و شوکت کیساتھ بدل گیا، عمر فاروقؓ کو دنیا جانتی ہے لیکن ان کے علاوہ اسلام کے میدان میں دوسرے شہسواروں کی بھی کچھ کمی نہ تھی، خالد بن ولیدؓ، ابوسفیانؓ، ثمامہؓ اور ان جیسے اور بڑے مشاہیر بھی موجود تھے جن سے اسلام کو سخت سے سخت نقصانات پہنچے، لیکن کبھی آپ نے اس کا وسوسہ بھی نہیں کیا کہ ان کے قتل کے متعلق کوئی بھی سازش تیار کی جائے، نتیجہ یہ نکلا کہ یہ سب قیمتی افراد ایک دن اسلام کے لئے انتہائی قابل فخر ثابت ہوئے اور بڑی بڑی فتوحات کے مالک بنے، اس جگہ اس تاریخ کو پھیلانا منظور نہیں لیکن حضرت وحشیؓ کا قصہ ذکر کئے بغیر قلم نہیں رُک سکتا، جنہوں نے زمانۂ کفر میں سیدنا حمزہؓ جیسی قیمتی شخصیت کو بڑی بے رحمی سے قتل کیا، لیکن اپنے اس محبوب چچا کے انتقام لینے کے لئے بھی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کبھی ارادہ نہیں فرمایا، حتیٰ کہ وہ مشرف باسلام ہوئے اور آپکے دامن عفو میں

ان کو بھی پناہ مل گئی، اسکا نتیجہ یہ نکلا کہ یہی تھے جنہوں نے
مسیلمہ کذاب مدعیٔ نبوت کو قتل کیا اور وہ خود فرمایا کرتے تھے
کہ جسطرح زمانۂ کفر میں مَیں نے بہترین شخصیت کو قتل کیا تھا
اسی طرح اسلام لانیکے بعد مَیں نے ایک بدترین شخص کو قتل کر کے
اسکی کچھ نہ کچھ تلافی کر دی ہے افراد کا تو ذکر کیا ہے، فتح مکہ کے
بعد آپنے اپنے دشمنوں کے ساتھ جس فیاضانہ طریقہ پر عفو عام کا
اعلان کیا اسطرح کی مثال ملنی مشکل ہے، خود آپ کے بیان
کے بموجب جو سب سے تنگ وقت آپکی زندگی میں آپکے اوپر
گذرا ہے وہ طائف کا دن تھا جبکہ آپنے اہلِ مکہ سے مایوس
ہوکر طائف کا اس امید پر رُخ کیا کہ شاید وہ آپکی دعوت کو
قبول کرلیں، لیکن انہوں نے جس بے رحمانہ انداز میں آپ کو
جواب دیا اسکی امید بھلا کس کو ہوسکتی تھی، اس مایوسی پر مایوسی
اور ناکامی پر ناکامی سے جو کوہِ غم آپ پر ٹوٹا اس کا اندازہ کون
لگا سکتا ہے؟ آپ کی اس شکستہ دلی کا سماں دیکھکر عالمِ بالا
سے ان فرشتوں کے نام جو پہاڑوں کے نظام کے لئے مقرر ہیں
یہ پیغام پہنچا کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر جو آپ کا حکم ہو
اسکی تعمیل کریں، چنانچہ وہ فرشتہ حاضر ہوا اور آدابِ نبوت

بجا لا کر اس نے یہ عرض کی کہ حکم ہو تو ان دو پہاڑوں کو جسکے درمیان یہ بستی واقع ہے ملا کر کچل ڈالوں؟ لیکن انسانیت کے اس سب سے بڑے قدردان نے اس حالت میں بھی جو جواب دیا وہ رَحمۃٌ لِّلعٰلَمِین کے سوا کسی سے ممکن نہ تھا، آپنے فرمایا نہیں نہیں ایسا مت کرو، کیونکہ عجب نہیں کہ اگر آج نہیں تو کل انمیں کچھ ہونہار ایسے پیدا ہو جائیں جو اللہ کی توحید کا کلمہ بلند کریں۔

محض زبانی طور پر چند کلمات ادا کر دینا اور بات ہے لیکن اپنے دشمنوں کے ساتھ عملاً اتنی قدردانی کا سلوک کرنا یہ کم معجزہ نہیں، آپ جانتے تھے کہ اگر قریش جیسے اہلِ شرف تہِ تیغ کر ڈالے گئے تو پھر اسلام اگر اپنے اطراف وجوانب میں پھیلا بھی تو کیا، اور اگر یہ اصحابِ شرف اسلام میں داخل ہو گئے تو دوسرے لوگ خود بخود فطری طریقہ پر رام ہو کر اسلام کے حلقہ بگوش ہو جائینگے۔

اسی عفو عام میں آپ کے مشن کی کامیابی کا راز مضمر تھا جسکو تیرہ سو سال بعد ابھی تھوڑا عرصہ ہوتا ہے جسکو مسٹر کنیڈی اور مسٹر خردشیف سمجھے ہیں پہلے دونوں نے ملکر عالم کی بربادی کے آلات تیار کئے لیکن چونکہ ابھی عالمِ تقدیر میں دنیا کی کچھ عمر باقی تھی اسلئے اچانک یہ بات دماغوں میں پیدا ہو گئی کہ اگر بالفرض

دنیا کے اکثر لائق افراد فنا کے گھاٹ اُتر گئے تو بھیڑ بکریوں پر حکومت کر کے بھی کیا ہوگا، یہ بات دوسری ہے کہ ایک جماعت نے اسکو مسٹر کنیڈی کے عزم کا نتیجہ سمجھا اور دوسری جماعت نے مسٹر خروشچوف کے ہوش وحزم کا، لیکن بانیِ اسلام تیرہ سو سال قبل اس بات کو اپنے قول و عمل سے واضح فرما چکے تھے۔

کم از کم مسلمانوں کا یہ فرض تھا کہ وہ حدیثوں کو عقیدت اور حقیقت کی نظر سے پڑھتے تو انکی کوئی مشکل ایسی نہ تھی جو آسان نہ ہو چکی ہوتی، لیکن اس کا گلہ کس سے کیا جائے کہ وہ دوسروں کی اتباع و محبت میں اتنے ڈوب چکے ہیں کہ اپنے مذہب کی تعلیم کی طرف نظر اٹھانا بھی پسند نہیں کرتے۔[1] اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

---

[1] میرے والد مرحوم و مغفور تذکرہ فرماتے تھے کہ جب اسیر مالٹا حضرت شیخ الہند رح کا انتقال ہوا تو ایک بہت بڑے انگریز نے انکے اعزا کے نام اپنی جانب سے تعزیتی پیغام بھیجا والد مرحوم نے اس انگریز سے فرمایا کہ یہ تعزیت کیا آپنے سچے دل سے کی ہے یا محض ایک رسم ہے، اس نے جواب دیا کہ سچے دل سے کی ہے، اسپر والد صاحب نے فرمایا کیا آپ انکو اپنا دشمن تصور نہیں کرتے تھے اسنے کہا یقیناً، والد مرحوم نے فرمایا پھر دشمن کی تعزیت کیسی، اس نے کہا کہ ہم کو اس کا یقین تھا کہ اگر کسی وقت بھی اور کسی حیلہ سے بھی یہ شخص ہمارے ساتھ آگیا تو تمام ہندوستان ہمارے ساتھ آجائیگا اب ہماری یہ امید ٹوٹ گئی کیونکہ ہماری نظروں میں اب کوئی اتنی مقبول ہستی نہیں ہے کہ صرف اسکے ساتھ آجانے سے ہم ہندوستان کو اپنے ساتھ ملا سکتے ہوں اسلئے اگرچہ وہ دشمن تھے لیکن ہم کو کچھ امیدیں باقی تھیں جو منقطع ہوگئیں اور اسلئے ایسی شخصیت کے فقدان کا ہم کو بھی افسوس ہے۔ فَاعْتَبِرُوْا یٰاُولِی الْاَبْصَارِ (سو عبرت پکڑو اے آنکھ والو)
(پارہ ۲۸ رکوع ۴)

خدا تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پیارا شخص وہ ہے جسکی نظر میں اسکی مخلوق سب سے زیادہ پیاری ہو

(۲) عَنْ اَنَسٍ وَّعَنْ عَبْدِ اللّٰہِ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْخَلْقُ عِیَالُ اللّٰہِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَی اللّٰہِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰی عِیَالِہٖ

(رواہ البیہقی فی شعب الایمان وفی الباب احادیث وصحاح مایدل علی ھذا المعنی ۔ مشکوٰۃ صفحہ ۴۲۵)

ترجمہ: حضرت انس اور حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہما روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ کے عیال نہیں لیکن اس سے بڑھ کر اسکے لئے اسکی مخلوق ہے، تو اسکی تمام مخلوق میں اللہ کو سب سے زیادہ پیارا وہ ہے جسکی نظروں میں اسکی مخلوق سب سے پیاری ہو جیسا کہ والد کو سب سے پیارا وہ شخص معلوم ہوتا ہے جسکی نظروں میں اسکی اولاد سب سے پیاری ہو۔

شرح: عیسائیت یہ کہتی ہے کہ خدا اور ابن آدم کے درمیان جو رشتہ تھا وہ ابنیت کا رشتہ تھا، اسی لئے انکا گمان ہی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انجیل میں جگہ جگہ جب اپنے خدا کو پکارا ہے تو

اے باپ! اے باپ! کہہ کر پکارا ہے، لیکن اسلام یہ کہتا ہے کہ
خدائے قدوس اور ایک مخلوق میں رشتہ کیا، وہ اس تعبیر کو مجاز
اور استعارے کے رنگ میں بھی ناقابلِ برداشت سمجھتا ہے
یہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اچھا اگر اسکی مخلوق اسکو
ڈھونڈھنا چاہے اور یاد کرنا چاہے تو پھر کس رشتے سے
ڈھونڈے اور یاد کرے، اسلام کہتا ہے کہ اسکا صرف ایک
رشتۂ محبت ہے اور یہ اسکی تمام مخلوق میں مشترک ہے اور
لفظ اَبْ (باپ) کی بجائے رَبْ (یعنی پالنے والا) کا تصور پیش
کرتا ہے، اسی لئے سورۃ الحمد میں اللہ کی صفات میں سے پہلی
صفت رب العلمین کی ارشاد فرمائی گئی ہے یعنی اس کو اَبْ
(باپ) کہنا غلط ہے وہ رَبْ ہے اور رَبْ بھی وہ جو رب العالمین
ہے ورنہ یوں تو کسی درجہ کی ربوبیت ہر باپ میں اپنے بیٹے کے
لئے موجود ہوتی ہے، مگر اللہ وہ نہیں جسکی ربوبیت اتنی سطحی
اور اتنی محدود ہو اسکی ربوبیت ربوبیتِ حقیقیہ ہے اور اتنی
وسیع ہے کہ اسکے احاطہ میں اسکی ساری مخلوق داخل ہے، اسی
لئے اسلام کی تعلیم کردہ محبت میں ایک انسان ہی نہیں بلکہ
اسکی تمام مخلوق داخل ہے، اسی لئے اسلام کی تعلیم کردہ محبت

میں ایک انسان ہی نہیں بلکہ اسکی تمام مخلوق کو بھی حصہ رسد ملا ہے۔

دراصل بات یہ ہے کہ ایمان اللہ تعالیٰ کی ذات پاک سے محبت کرنیکا ہی دوسرا نام ہے لیکن خدا کی محبت کی یہ راہ رسول کی محبت میں پھر رسول سے صحابہؓ کی محبت میں اور اس طرح درجہ بدرجہ عام مؤمنین کی محبت میں پھر اسکی تمام مخلوقات کی محبت میں سے ہو کر گذری، اسلئے خدا کی محبت تک رسائی کے لئے ان محبتوں کو عبور کرنا ناگزیر ہے جو ان محبتوں سے گذر جاتا ہے وہ خدا تعالیٰ کی محبت پا کر رہتا ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ اسکی صورتیں مختلف ہیں، ظاہر ہے جب کوئی عضو سڑ جاتا ہے تو اس کا کاٹ دینا ہی عین محبت ہے اور جیسا کہ کوئی درخت اگر بالکل خشک ہو جائے تو اُس کو پانی دیئے چلے جانا کھلی حماقت ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اسلامی نظر میں خدا تعالیٰ صرف معبود ہی نہیں بلکہ محبوب بھی ہے اور محبوب بھی وہ کہ اس کی محبت میں فنا ہو کر اسکی پیدا کردہ ساری مخلوق بھی نظروں میں محبوب بن جائے اور وہ بھی صرف زبانی حد تک نہیں بلکہ اسکی مخلوق کے ساتھ ہمدردی کا وہ سلوک کیا جائے جو اسکے

دعویٰ محبت کے لئے شاہد صدق بن سکے۔

اسلام پر اعتراض کرنے والے تاریخ سے پوچھ کر دیکھیں کہ جب تک کوئی جماعت یا فرد خدا کی پیاری مخلوق کے لئے کانٹا بن کر نہ رہ گیا اسلام نے کبھی بھی اس کی طرف انگلی اٹھائی ہے؟

(۳) عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يَقُوْلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَا ابْنَ اٰدَمَ مَرِضْتُ فَلَمْ تَعُدْنِیْ قَالَ يَا رَبِّ كَيْفَ اَعُوْدُكَ وَاَنْتَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ قَالَ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّ عَبْدِیْ فُلَانًا مَرِضَ فَلَمْ تَعُدْهُ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّكَ لَوْ عُدْتَّهٗ لَوَجَدْتَّنِیْ عِنْدَهٗ يَا ابْنَ اٰدَمَ اسْتَطْعَمْتُكَ فَلَمْ تُطْعِمْنِیْ قَالَ يَا رَبِّ كَيْفَ اُطْعِمُكَ وَاَنْتَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ قَالَ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّهُ اسْتَطْعَمَكَ عَبْدِیْ فُلَانٌ فَلَمْ تُطْعِمْهُ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّكَ لَوْ اَطْعَمْتَهٗ لَوَجَدْتَّ ذٰلِكَ عِنْدِیْ يَا ابْنَ اٰدَمَ اسْتَسْقَيْتُكَ فَلَمْ تَسْقِنِیْ قَالَ يَا رَبِّ كَيْفَ اَسْقِيْكَ وَاَنْتَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ قَالَ اسْتَسْقَاكَ عَبْدِیْ فُلَانٌ فَلَمْ تَسْقِهٖ اَمَا اَنَّكَ لَوْ سَقَيْتَهٗ وَجَدْتَّ ذٰلِكَ عِنْدِیْ۔ رواہ مسلم

(مشکوٰۃ صفحہ ۱۳۳)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے ایک حدیث قدسی میں روایت ہے کہ قیامت میں خدائے قدوس اپنے ایک بندہ سے مخاطب ہوکر فرمائیگا اے ابن آدم! میں بیمار پڑا اور تونے میری عیادت تک نہ کی۔ وہ عرض کریگا اے رب العلمین تیری شان اس سے کہیں اعلٰی وارفع ہے میں تیری عیادت کیا کرتا اور کیسے کرتا، ارشاد ہوگا کہ میرا ایک بندہ بیمار ہوا تھا تونے اسکی عیادت نہ کی، تو اتنا بھی نہیں جانتا کہ اگر تو اسکی عیادت کرتا تو مجھ کو اسکے پاس پاتا (یہی میری عیادت کا مطلب ہے) اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا طلب کیا مگر تونے مجھکو کھانا نہیں کھلایا، وہ عرض کریگا میں تجھکو بھلا کھانا کیسے کھلاتا اور تُو تو خود تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔ ارشاد ہوگا کہ میرے فلاں بندہ نے تجھ سے کھانا مانگا تھا مگر تونے اسکو کھانا نہیں کھلایا، تجھکو اتنی خبر بھی نہیں کہ اگر تو اسکو کھانا کھلاتا تو اسکا نتیجہ آج میرے حضور میں خود دیکھ لیتا، اے ابن آدم میں نے تجھسے پانی مانگا تھا اور تونے مجھکو پانی نہیں پلایا، وہ عرض کریگا میں تجھکو بھلا کیا پانی پلاتا تُو تو خود رب العلمین ہے، ارشاد ہوگا میرے فلاں بندہ نے تجھ سے پانی مانگا تھا اور تُونے اسکو پانی نہیں دیا تھا، سن لے کہ اگر تُو اسکو پانی پلا دیتا تو آج میرے یہاں اس کا بدلہ پا لیتا۔

شرح: ظاہر ہے کہ بیمار کے ساتھ محبت کرنا یہی ہے کہ اس کی

بیمار پرسی کی جائے اور ایک بھوکے اور پیاسے کے ساتھ محبت کا ثبوت یہی ہے کہ اس کو کھانا کھلایا جائے اور پانی پلایا جائے، یہ تمام نسبتیں وہ ہیں جن سے خدائے قدوس کی ذات منزہ و مبرا ہے، لیکن آپ نے دیکھا کہ محبت کی یہ تمام نسبتیں کس طرح اسکے بندوں میں سے گذر کر کتنی شائستہ تعبیر کے ساتھ خود خدائے قدوس کی طرف منتقل ہو گئیں۔

تعبیر کی شائستگی یہ ہے کہ پہلے سوال کے جواب میں یہ ارشاد فرمایا گیا کہ لَوَجَدْتَنِیْ عِنْدَہٗ یعنی تو یہ محسوس کرتا کہ میں اس بندہ کے پاس گویا خود موجود ہوں اور کھانا پینا اگرچہ مرض کی طرح ان عوارض میں سے ہے جس سے حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات پاک منزہ و مبرا ہے تاہم یہاں لَوَجَدْتَنِیْ عِنْدَہٗ کی بجائے لَوَجَدْتَ ذٰلِکَ عِنْدِیْ فرمایا گیا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تو اس کا ثواب آج میرے دربار میں دیکھ لیتا، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مریض پر خدا تعالیٰ کی رحمت اس طرح برستی ہے گویا وہی اس کا تیماردار ہے اسلئے بیمار پرسی کے وقت بھی اس کا موجود ہونا کسی غلط فہمی کا باعث نہیں ہو سکتا لیکن جو کھانے اور پینے سے کہیں بالاتر ہو اسکی کھلانے اور پلانے کے وقت موجودگی کا بیان کرنا یہ

خوبصورت تعبیر نہیں، گو یہ سب کچھ ایک پیرایۂ بیان سہی لیکن اسکے لئے بھی جو راہ کھلی وہ اس کی پیاری مخلوق کی محبتوں میں سے گذر کر ہی کھلی۔

اس حدیثِ قدسی میں خدائے قدوس نے اپنے بندہ کے ساتھ خطاب کا جو محبت آمیز لب ولہجہ اختیار فرمایا ہے اس کو سن کر اگر کوئی درحقیقت انسان ہو تو ندامت سے تا قیامت اس کا سر اُٹھ نہ سکے، ایک ایک جملہ سے ایسی محبت ٹپک رہی ہے کہ کوئی بڑا شفیق مُربّی اپنے بندہ کے ساتھ انتہائی محبت کے انداز میں گویا اس کی کوتاہی پر گلہ وشکوہ کر رہا ہے۔ وَاللّٰہُ اَعْلٰی وَاَجَلّ۔

سُبحان اللہ ایک طرف اس غنیِ مُطلق کا اندازِ خطاب کیا ہے اور دوسری طرف ہم سر تا سر محتاجوں کا حالِ زبوں کیا ہے، یعنی اس حسنِ سلوک کے لئے اپنے گھر سے باہر قدم نکالنا بھی ہماری بڑی کسرِ شان ہے۔ خالقِ مطلق کی برتری اور ایک محتاج مخلوق کی ابتری کا اس سے اندازہ فرمالیجئے۔

———— ❖ ————

مؤمن وہ ہے جو سرتاپا اُنس و محبت کا پُتلا ہو

(۴) عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رضؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْمُؤْمِنَ مَاْلَفٌ وَلَا خَیْرَ فِیْمَنْ لَّا یَاْلَفُ وَلَا یُؤْلَفُ۔

(رواہ احمد والبیہقی فی شعب الایمان والحاکم فی المستدرک)
مشکوٰۃ صفحہ ۴۲۵

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایمان دار آدمی تو وہ ہے جو مجسم پیکرِ محبت ہو، جو شخص کسی سے الفت نہ رکھے اور نہ اس سے کوئی اُلفت رکھے، یاد رکھو کہ اسمیں بھلائی کی بو بھی نہیں۔

شرح: حدیث مذکور میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ ایک مسلمان کو اُنس و محبت میں حاکم و محکوم، غریب و امیر، عالم و جاہل ہر کس و ناکس کا امتیاز اٹھا دینا چاہیئے کیونکہ محبت ہی وہ نعمت ہے جس سے نظامِ عالم وجود میں آیا اور اسی نعمت کے ساتھ اس کا بقاء بھی مربوط ہے۔ مخلوقات میں کوئی مخلوق اس وقت تک حقیقت کا رنگ پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ اسکے اجزاء میں پورا پورا امتزاج اور ایک دوسرے کے ساتھ

پوری پوری احتیاج موجود نہ ہو، خواہ خود اس کا شعور ہو یا نہ ہو حتیٰ کہ انسانی مصنوعات بھی اس وقت تک کسی مشینری کی شکل اختیار نہیں کر سکتیں جب تک کہ اسکے متفرق پرزوں کو ایک دوسرے کے ساتھ متصل نہ کر دیا جائے' اسی نظام کے قائم رکھنے کے لئے تمام عالم کو ایک دوسرے کے ساتھ ایسا اُلجھا دیا ہے جس کی وجہ سے بڑی بڑی مملکتین بھی چھوٹی چھوٹی حکومتوں کی خوشامد کرنے پر مجبور نظر آتی ہیں، اب آپ کو اختیار ہے کہ آپ اس کو فطرت کی طرف منسوب کریں یا قدرت کا کرشمہ سمجھیں۔

انسان چونکہ اشرف المخلوقات ہے اسلئے اسکی شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے احتیاج و عدم احتیاج کے علاقہ سے بالاتر ہو کر اپنے مابین محبت کا علاقہ پیدا کرے تاکہ عالمِ انسان سے لیکر عالمِ حیوانات تک اطمینان و سکون کی زندگی بسر کر سکے۔

ایک حدیث میں اس حقیقت کو یوں ادا فرمایا گیا ہے کہ تمام مسلمانوں کی مثال ایک جسم کی سی ہے کہ اگر اس کا ایک عضو بھی بیمار پڑ جاتا ہے تو اسکی بے چینی سے اسکا تمام جسم

بے چین رہتا ہے۔ عرب کا ایک شاعر کہتا ہے ؎

وَمَا سُمِّیَ الْاِنْسَانُ اِلَّا لِاُنْسِہٖ
وَمَا الْقَلْبُ اِلَّا اَنَّہٗ یَتَقَلَّبُ

یعنی انسان کو انسان کہتے ہی اسلئے ہیں کہ وہ سر تا پا اُنس ہی اُنس ہوتا ہے، اور قلب کا نام اسی لئے قلب ہے کہ وہ ہر وقت دھڑکتا ہے۔

اسلام سے قبل عرب خاص طور پر جس نعمت سے محروم تھا وہ یہی محبت کی نعمت تھی، پھر اسلام کے بعد سب سے پہلے وہ جس نعمت سے سرفراز کیا گیا وہ یہی نعمت تھی، اسی کو آیتِ ذیل میں یاد دلایا گیا ہے:۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ط

(اور یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر جب کہ تھے تم آپس میں دشمن پھر الفت دی تمہارے دلوں میں، اب ہو گئے اسکے فضل سے بھائی)

(پارہ ۴ رکوع ۲)

یہ خوب یاد رکھنا چاہئے کہ یہ نعمت نہ تو سیم و زر کی طرح سے حاصل ہو سکتی ہے اور نہ جبر و تشدّد کی طاقت سے، بلکہ یہ خالقِ کائنات کا براہِ راست ایک انعام ہے جو اُسکی

مخلوق میں اُن بندوں پر کسی ظاہری سبب کے بغیر ہو جاتا ہے جو اس کے صحیح معنیٰ میں بندے بن جاتے ہیں اس حقیقت کو قرآن کریم نے ان الفاظ سے ادا فرمایا ہے:۔

لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِہِمْ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ اَلَّفَ بَیْنَہُمْ۔

(اگر تو خرچ کر دیتا جو کچھ زمین میں ہے سارا، نہ اُلفت ڈال سکتا انکے دلوں میں لیکن اللہ نے الفت ڈالی ان میں) (پارہ ۱۰ رکوع ۴)

بدقسمتی سے جب مخلوق کی شامت اعمال کی بدولت یہ نعمت اُن سے چھین لی جاتی ہے تو ہمیشہ بدامنی اور قتل و غارت کے بادل عالم پر برسنے لگتے ہیں۔

اب آپ اپنے عقلی فلسفہ سے تھوڑی دیر کیلئے علیحدہ ہو کر ذرا انصاف کے ساتھ اس شرعی فلسفہ پر غور کر کے دیکھیں اور سوچیں کہ ان تمام ترقیات اور باہم محبت کی تمام جدوجہد کے باوجود وہ کیا بات ہے جسکی بناء پر موجودہ عالم کو اطمینان وسکون کا ایک سانس لینا بھی مشکل ہو رہا ہے، آپ کو صاف روشن ہو جائے گا کہ جو نعمت اسلام نے ہم کو اُنس و محبت کی عطا فرمائی تھی آج اسلام کو چھوڑ کر اُس متاعِ گرانمایہ کو خود اپنے

ہاتھوں سے کھو بیٹھے ہیں، اگر ہم صرف اسی ایک صفت کو اپنی قوم میں پیدا کرلیں تو ہماری معاشرت میں بغض و عناد، شر و فساد اور دیگر وحشیانہ حرکات کی بجائے اُنس و محبت، صُلح و آشتی اور انسانیت کے دُوسرے شریفانہ افعال بہت جلد پھر پیدا ہو جائیں گے۔

اسلام نے اپنے ابتدائی دور سے لے کر اپنے انتہائی عروج کے دَور تک جو قدم بھی اٹھایا ہے وہ اسی قانونِ محبت کے تحت اُٹھایا ہے، اب ناقدر دنیا جن الفاظ سے چاہے اس کو تعبیر کرے، کِسی شاعر نے اسی مضمون کو اپنے ایک شعر میں بڑی خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے جو ذرا سی ترمیم کے ساتھ درج ذیل ہے ؎

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ اُلفت
موت کیا ہے ان ہی اجزاء کا پریشاں ہونا

(۵) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ غُفِرَ لِامْرَأَةٍ مُّوْمِسَةٍ مَّرَّتْ بِکَلْبٍ عَلٰی رَأْسِ رَکِیٍّ یَّلْهَثُ کَادَ یَقْتُلُهُ الْعَطَشُ فَنَزَعَتْ خُفَّهَا فَاَوْثَقَتْهُ بِخِمَارِهَا فَنَزَعَتْ لَهٗ مِنَ الْمَآءِ فَغُفِرَ لَهَا بِذٰلِكَ قِیْلَ اِنَّ لَنَا

فِی الْبَهَائِمِ اَجْرًا قَالَ فِیْ کُلِّ ذَاتِ کَبِدٍ رَّطْبَةٍ اَجْرٌ۔

متفق علیہ، مشکوٰۃ صفحہ ۱۶۸

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی عورت کی جو فاحشہ تھی صرف اتنی سی بات پر مغفرت فرمادی کہ اس کا گذر ایک پیاسے کتّے پر ہوا جو ایک کنویں کی مینڈ پر پیاس کی شدت سے زبان نکالے پڑا تھا اور دم توڑ رہا تھا، اس کو دیکھ کر اس سے رہا نہ گیا بس فوراً اس نے اپنے سر کی اوڑھنی اتاری اور اپنے پیر کا جوتا اسمیں باندھ کر کنویں سے پانی نکالا اور اسکو پلادیا، بس دریائے رحمت جوش میں آگیا اور اسی بات پر اللہ تعالیٰ نے اسکو بخش دیا، صحابہ رضؓ نے عرض کی یا رَسُوْلَ اللہ صلعم جانوروں کے ساتھ ہمدردی کا بھی ہم کو ثواب ملے گا؟ آپ نے فرمایا جی ہاں جانور تو جانور ہر جاندار کے ساتھ ہمدردی کرنے پر تم کو ثواب ملے گا۔

(۶) عَنِ ابْنِ عُمَرَ وَاَبِیْ هُرَیْرَةَ رضؓ قَالَا قَالَ رَسُوْلُ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عُذِّبَتِ امْرَأَةٌ فِیْ هِرَّةٍ اَمْسَکَتْهَا حَتّٰی مَاتَتْ مِنَ الْجُوْعِ فَلَمْ تَکُنْ تُطْعِمُهَا وَلَا تُرْسِلُهَا فَتَاْکُلُ مِنْ خَشَاشِ الْاَرْضِ

متفق علیہ، مشکوٰۃ صفحہ ۱۶۸

ترجمہ: ابن عمر اور ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک عورت اتنی سی بات پر عذاب میں گرفتار ہوئی کہ اس نے ایک بلی کو باندھ رکھا تھا پھر نہ اس کو کھلایا پلایا اور نہ اس کو کھولکر چھوڑا کہ وہ چل پھر کر خود زمین کے کیڑے مکوڑے کھا لیتی۔

(۷) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَۃَ رضؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ حَتّٰی تُؤْمِنُوْا وَلَا تُؤْمِنُوْا حَتّٰی تَحَابُّوْا اَوَلَا اَدُلُّکُمْ عَلٰی شَیْءٍ اِذَا فَعَلْتُمُوْہُ تَحَابَبْتُمْ اَفْشُوا السَّلَامَ بَیْنَکُمْ۔ رواہ مسلم مشکوٰۃ صفحہ ۳۹۷

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تک تم ایمان نہیں لاؤ گے، جنت میں نہیں جاؤ گے اور جب تک باہمی محبت نہ کرو گے پورے مؤمن نہیں بنو گے، تو کیا میں تم کو وہ بات نہ بتادوں کہ جب اس کے خوگر ہو جاؤ تو باہمی محبت کرنے لگو (وہ یہ ہے) کہ آپس میں ہر شخص کو سلام کیا کرو خواہ وہ تمہارا آشنا ہو یا ناآشنا۔ (مسلم شریف)

شرح: جنت کیا ہے؟ یہ وہ متاعِ گراں ہے جس کے متعلق حدیث شریف سے صرف اتنا ہی پتہ ملتا ہے کہ اسکی نعمتیں نا کسی نے دیکھیں، نہ کسی کے کانوں نے سنیں اور نہ کسی کے دل میں

انکا گذر ہوا، حدیث کا اسلوب بیان کتنا پیارا ہوتا ہے کہ اس متاعِ گراں کو رفتہ رفتہ اتنا ارزاں فرما دیا کہ گویا اسکی قیمت آخر میں صرف ایک لفظ "سلام" رہ گئی ہے

اس نعمتِ عظمیٰ کا حصول پہلے تو ایمان یعنی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ تصدیق قلبی کے ساتھ پڑھنا قرار دیا، اگرچہ اس کلمہ کا پڑھنا مشکل بھی کیا اور کسی صحیح حقیقت کی تصدیق میں دشواری ہی کیا، لیکن پھر اسکے حصول کا ذریعہ ایک ایسی صفت کو ٹھیرا دیا جو ہر شریف انسان میں قدرتاً ودیعت رکھی گئی ہے یعنی اُنس و محبت، لیکن اُنس و محبت کا لِوَجْہِ اللّٰہِ ہونا پھر ایک ٹیڑھی کھیر ہے اس لئے محبت کے حصول کا ذریعہ ایک ایسے خوشنما کلمہ کو ٹھیرا دیا جس کو زبان سے ادا کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی.

اب اگر اسی سبق کو آپ یوں پڑھیں تو وہ اور آسان نظر آتا ہے یعنی کثرت سے ایک دوسرے کو سلام کرنے سے محبت پیدا ہوتی ہے اور اس محبت سے ایمان کی شیرینی دل میں اترنے لگتی ہے اور اس مختصر راستہ سے اگر کوئی چاہے تو "خدا کی جنت" بڑی آسانی سے مل سکتی ہے۔

"داتا ہو تو ایسا ہو"

اس حدیث سے ایک اصلِ عظیم یہ بھی معلوم ہوئی کہ بعض نیکیاں دیکھنے میں گو معمولی ہوتی ہیں جیسے ایک لفظ "سلام" مگر ان کے ثمرات بہت دُور رس اور قیمتی ہوتے ہیں، آہ! افسوس کہ انگریزوں کی نقّالی میں آج مسلمانوں کا معاشرہ کا معاشرہ لفظ سلام سے تقریباً خالی ہو گیا ہے اور اس پر حسرت یہ کہ اسکی جگہ دوسری بے معنیٰ حرکات ــــ بے معنیٰ الفاظ نے لے لی ہیں۔

جب کسی قوم کا دورِ انحطاط آتا ہے تو ہمیشہ وہ اسی طرح اپنے عمدہ خصائل چھوڑتی جاتی ہے اور دوسروں کے خسیس رذائل اختیار کرتی چلی جاتی ہے۔

بہترین حکومت وہ ہے جسمیں حاکم و محکوم کے درمیان محبّت کا مضبُوط علاقہ موجُود ہو

(۸) عَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ الْأَشْجَعِيِّ رضی اللہ عنہ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خِيَارُ أَئِمَّتِكُمُ الَّذِيْنَ تُحِبُّوْنَهُمْ وَيُحِبُّوْنَكُمْ وَتُصَلُّوْنَ عَلَيْهِمْ وَيُصَلُّوْنَ

عَلَيْكُمْ وَشِرَارُ اَئِمَّتِكُمُ الَّذِيْنَ تُبْغِضُوْنَهُمْ وَ يُبْغِضُوْنَكُمْ وَتَلْعَنُوْنَهُمْ وَيَلْعَنُوْنَكُمْ قَالَ قُلْنَا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَفَلَا نُنَابِذُهُمْ عِنْدَ ذٰلِكَ قَالَ لَا مَا اَقَامُوْا فِيْكُمُ الصَّلٰوةَ لَا مَا اَقَامُوْا فِيْكُمُ الصَّلٰوةَ اَلَا مَنْ وُلِّيَ عَلَيْهِ وَالٍ فَرَاٰهُ يَاْتِيْ شَيْئًا مِّنْ مَّعْصِيَةِ اللّٰهِ فَلْيَكْرَهْ مَا يَاْتِيْ مِنْ مَّعْصِيَةِ اللّٰهِ وَلَا يَنْزِعَنَّ يَدًا مِّنْ طَاعَةٍ - رواہ مسلم مشکوٰۃ صفہ ۳۱۹

ترجمہ: حضرت عوف بن مالک اشجعیؓ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا تمہارے بہترین حاکم وہ ہیں جو تم سے محبت رکھیں اور تم ان سے محبت رکھو، وہ تم کو دعائیں دیں، تم ان کو دعائیں دو اور بدترین حاکم وہ ہیں جو تم سے بغض رکھیں اور تم ان سے بغض رکھو، اور وہ تم پر لعنت کریں اور تم ان پر لعنت کرو، ہم نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا ان بدترین حاکموں کے ساتھ ہم اپنا رشتۂ اطاعت توڑ کر پھینک نہ دیں، آپنے فرمایا ہرگز نہیں جب تک کہ وہ تمہاری باجماعت نمازوں کا نظام قائم رکھیں (تاکیداً یہ دوبار فرمایا) خوب سن لو کہ جب کسی پر کوئی حاکم مقرر ہو اور وہ یہ دیکھے کہ وہ خدا کی معصیت میں مبتلا ہے تو اصول یہ ہے کہ اسکی معصیت

کو دل میں نفرت کی نظر سے دیکھے لیکن ظاہری طور پر اسکی اطاعت
سے دست کش نہ ہو۔

شرح: حدیث بالا میں بھی حاکم و محکوم کی خوش بختی کی
علامت محبت ہی کو قرار دیا گیا ہے، لیکن ادھر ایک دائمی قانون
کا مؤسس یہ دیکھ رہا تھا کہ اس انقلابات کی دنیا میں ہمیشہ
معیاری حاکم میسر آنا ممکن نہیں، اسلئے اگر چھوٹے بڑے
اختلافات کے ساتھ حکومت کی بر سر بازار مخالفت کی
اجازت دیدی جائے تو پھر مستقبل میں کسی حکومت کا قیام
بھی مشکل ہو جائے گا۔

اسلام کی نظر میں افتراق و تشتت اور شر و فساد اور
فتنہ پردازی کی اتنی اہمیت محسوس کی گئی ہے کہ اسکو قتل
جیسے قبیح جرم سے زیادہ بڑھ کر قرار دے دیا گیا ہے۔

وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ

(اور دین سے بچلانا مار ڈالنے سے بھی زیادہ سخت ہے)

(پارہ ۲ رکوع ۸)

اسلام کا جماعتی نصب العین صرف شان و شکوہ کی برتری نہیں بلکہ اعمال و کردار کی بہتری ہے

(۹) عَنْ عَمْرِو بْنِ مُرَّةَ اَنَّہٗ قَالَ لِمُعَاوِیَۃَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ وَّلَّاہُ اللّٰہُ شَیْئًا مِّنْ اَمْرِ الْمُسْلِمِیْنَ فَاحْتَجَبَ دُوْنَ حَاجَتِہِمْ وَخَلَّتِہِمْ وَفَقْرِہِمْ احْتَجَبَ اللّٰہُ دُوْنَ حَاجَتِہٖ وَخَلَّتِہٖ وَفَقْرِہٖ فَجَعَلَ مُعٰوِیَۃُ رَجُلًا عَلٰی حَوَائِجِ النَّاسِ۔ رواہ ابوداؤد والترمذی مشکوٰۃ صفہ ۳۲۴

ترجمہ: عمرو بن مُرّہ سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت معاویہ رضؓ سے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کو مسلمانوں کا حاکم مقرر فرمائے اور وہ مسلمانوں کی ضروریات اور حاجات سے غافل ہو کر بیٹھا رہے تو اس کو یاد رکھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ بھی محشر میں اسکی ضرورت اور حاجت کی کوئی شنوائی نہ فرمائے گا، یہ حدیث سنکر حضرت معاویہ رضؓ نے اس بات کے لئے مستقل ایک شخص مقرر کر دیا کہ جو لوگوں سے پوچھ پوچھ کر ان کی ضروریات کو ان کے سامنے پیش کرتا ہے۔

(۱۰) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رضی اللہ عنہ اَنَّہٗ کَانَ اِذَا بَعَثَ عُمَّالَہٗ شَرَطَ عَلَیْھِمْ اَنْ لَّا تَرْکَبُوْا بِرْذَوْنًا وَلَا تَاْکُلُوْا نَقِیًّا وَّلَا تَلْبَسُوْا رَقِیْقًا وَّلَا تُغْلِقُوْا اَبْوَابَکُمْ دُوْنَ حَوَآئِجِ النَّاسِ فَاِنْ فَعَلْتُمْ شَیْئًا مِّنْ ذٰلِکَ فَقَدْ حَلَّتْ بِکُمُ الْعُقُوْبَۃُ ثُمَّ یُشَیِّعُھُمْ۔

رواہ البیہقی فی شعب الایمان مشکوٰۃ صفحہ ۳۲۴

ترجمہ: حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ جب وہ کسی اپنے کارندے کو کسی جانب روانہ فرماتے تو اس کے ساتھ یہ چند شرطیں کر لیتے یہ کہ ترکی گھوڑے پر سوار مت ہونا اور میدہ مت کھانا اور باریک کپڑے مت پہننا اور لوگوں کی ضروریات سننے کے لئے ہر وقت اپنے دروازے کھلے رکھنا اور ان کو بند مت کرنا اگر تم نے ان میں سے ایک بات کی بھی خلاف ورزی کی تو یاد رکھنا اس کا نتیجہ تم کو بھگتنا ہوگا، یہ کلمات کہہ کر پھر رخصت فرماتے۔

شرح: حدیث کی شرح سمجھنے سے پہلے یہ اپنے پیش نظر رکھئے کہ یہ فرمان اس شخص کا ہے جس کے متعلق بعض انگریزوں کا یہ مقولہ ہے کہ اگر کہیں اسلام میں اسی شان کا دوسرا عمر اور پیدا ہو جاتا تو تمام روئے زمین پر ایک مسلمانوں کے سوا دوسرا کوئی حکمران نظر نہ آتا، تاریخ آپ کو یہ بتلا دے گی

کہ اس کی یہ رائے کسی جبر و تشدّد کی بنا پر نہ تھی کیونکہ دنیا کبھی جبر و تشدد سے رام نہیں ہو سکتی بلکہ ان کے حسنِ تدبیر اور حسن تدبّر کی بنا پر تھی اور اسی کے ساتھ اس کا بھی لحاظ رکھئے کہ یہ شخصیت وہ تھی جس کی عمر کا اکثر حصہ ایسے تنگ حالات میں گذرا ہے کہ اس وقت کبھی کبھی مسلمانوں کی تمام فوج میں انگلیوں پر گنے ہوئے چند گھوڑے ہوتے تھے جبکہ دشمنوں کی فوج ہر قسم کے سامانوں سے لَیس اور مُسلّح ہوتی تھی، ان کی غذا حالتِ امن میں جَو کا آٹا اور وہ بھی بغیر چھنا ہوا اور ان کا فوجی راشن کبھی کبھی صرف کھجور کی گٹھلیاں ہوتی تھیں پھر ان کے لباس کا کیا پوچھنا ہی ان کے تن یا تو ہمہ وقت زرہ پوش رہتے تھے یا اگر کبھی زرہ اتارنے کی نوبت آتی تو جانوروں کے کچے چمڑے جسم سے لپیٹ لیا کرتے تھے۔

یہ وہ شخصیت تھی جو اپنے دورِ حکومت میں تخت پر بیٹھ کر اپنے پھاٹک بند کرنے کی بجائے رات کی تاریکیوں میں چھپ چھپ کر مدینہ کی گلیوں میں مارے مارے پھرتے کہ اگر کسی کو اپنی ضرورت بیان کرنے میں کوئی امر مانع ہو تو

براہِ راست خود جاکر اس کا تجسس کریں، اس ضمن میں جو واقعات تاریخ میں موجود ہیں اگر ان کو نقل کیا جائے تو پھر یہ مختصر رسالہ ایک رسالہ باقی نہیں رہ سکتا بلکہ ایک ضخیم جلد بن جائے گا۔

(۱) اب اس روشنی میں آپ اس پر غور کریں کہ اگر حاکم خود ایسا ہو اور اس کا دَور وہ دَور ہو جو آپ اوپر ملاحظہ فرما چکے تو اس کو اپنے کارندوں کو مذکورۂ بالا شرائط کا پابند کر دینا کتنا معقول اور حاکم اور محکوم کی عام معاشرتی زندگی میں توازن قائم رکھنے کے لئے کتنا ضروری تھا، لیکن اب جبکہ اللہ تعالےٰ نے اپنے فضل و رحمت سے ہر چیز میں فراغت و رفاہیت عطا فرما رکھی ہے گھوڑوں کے بجائے موٹر اور موٹروں سے بڑھ کر ہوائی جہاز میسر فرما دیئے ہیں اور لباس بھی اچھے سے اچھا آسانی سے نصیب ہو جاتا ہے اور گیہوں کا میدہ بھی قلیل و کثیر اکثریت کو مل جاتا ہے تو اب ان الفاظ کی ظاہری صورت پر جمود کرنا یا اس پر اعتراض کرنا یہ سراسر نافہمی ہے، البتہ اس فرمان کی روح جو آج بھی ہماری زندگی کا نصب العین ہونا چاہیئے

یعنی اپنے زمانہ کے سازوسامان کے مطابق اور اپنی حیثیت کا لحاظ رکھتے ہوئے ہم خدا تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتیں استعمال کر سکتے ہیں لیکن قدم قدم پر اگر ہم کو باعزت زندگی درکار ہے تو ہمارے دماغوں میں عیش پرستی کا تخیل کہیں دُور دُور بھی نہ آنا چاہیے اور جفاکشی کی زندگی کا ہمیشہ عادی رہنا چاہیئے۔

ابھی علی برادران مرحوم کو غالباً دنیا نے فراموش نہیں کیا ہے، یہ وہ زمانہ تھا جبکہ اس قسم کے لوگ بھی موجود تھے جو ہندوستانی کپڑے کا استعمال تو درکنار، ہندوستانی دُھلے ہوئے کپڑے کا پہننا بھی عار سمجھتے تھے پھر اسی زمانے میں شدہ شدہ یہ نوبت آگئی کہ جو گاڑھا پہنتا اور وہ بھی کھدر کا بُنا ہوا تو بڑی عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا اور جو شخص ململ ولٹھا پہنے ہوئے نظر آتا وہ جدھر بھی نکلتا انگلیاں اسکی طرف اٹھنے لگتی تھیں پھر کتنی ناانصافی ہوگی کہ اس عہد سے تازہ تازہ گذرنے والے عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فرمانِ مذکور پر کوئی ادنیٰ سی لب کشائی کا بھی ارادہ کرے۔

(۲) اب ذرا اور گہری نظر ڈالئے تو آپ کو معلوم ہوگا

کہ حکام کی عیش پرستی کا نتیجہ یہ نکل کر رہتا ہے کہ وہ اپنے
فرائض اور ذمہ داریوں میں غفلت کرنے لگتے ہیں اور
آگے بڑھ کر رفتہ رفتہ اس بُری عادت سے رشوت خوری کا
روگ لگ جاتا ہے کیونکہ جب انسان عیش پرستی میں پڑ کر
اپنی محدود تنخواہ میں اپنی غیر محدود ضروریات پوری نہیں
کر سکتا تو اُسکے لئے اِسکے سوا کوئی اور چارۂ کار نہیں رہتا کہ
وہ ضعیف انسانوں کا خون چوس چوس کر اپنی خواہشات کو
پورا کرے۔

(۳) اب اس پر غور کیجئے کہ جب حاکم اتنا عیش پرست ہو
تو بقیہ مملکت پر اسکے کیا اثرات پڑیں گے، سب سے پہلے یہ ہوگا
کہ حسبِ قاعدہ اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِہِمْ وہ بھی عیش پرستی
میں مبتلا ہوں گے اور جب حاکم رشوت خور ہو تو رعایا کو
رشوت دینا لازمی امر ہوگا اور اسکے لئے لازمی طور پر ان کو
بلیک مارکٹنگ (BLACK MARKETING) اسمگلنگ
(SMUGGLING) اور اسی طرح کے دوسرے راستے تلاش
کرنے پڑیں گے، مقدمات کی گرم بازاری ہو جائے گی اور
بالآخر ملک میں قانون کے پردہ میں لاقانونیت پیدا

ہو کر رہیگی اور ایک ایسا مرض ہو گا کہ جو حاکم و محکوم دونوں میں سرایت کر جائے گا تو پھر یہ مثل مشہور صادق آنا ضروری ہو گی کہ مقدمہ بازی کر کے جو فریق ہارتا ہے وہ تو ہارتا ہی ہے لیکن جو جیتتا ہے وہ بھی درحقیقت ہارتا ہے کیونکہ اس بیچارہ کا مقدمہ بازی میں کَس نکل جاتا ہے اور قانون صرف عوام میں جنگ کا ایک ذریعہ بن کر رہجاتا ہے۔

(۴) اب آئیے دیکھئے اس کا بہت بڑا اثر دشمنوں پر کیا پڑتا ہے تو ظاہر ہے کہ جب کسی قوم کا شیرازہ ان کو اسطرح بکھرا ہوا نظر آتا ہے تو وہ ملک کو جنگ کے ذریعہ فتح کرنیکی بجائے صرف چند پیسوں سے فتح کر لینا آسان سمجھنے لگتے ہیں اور ظاہر ہی کہ جو ظالم حاکم اپنی خواہشات کی خاطر اپنے ملک کے خون کی کوئی قیمت نہیں سمجھتا وہ چند پیسہ میں اپنے ملک کو بیچنے میں کیا تامل کر سکتا ہے، آج اسکے شواہد دنیا کی آنکھوں کے سامنے ہیں نام لیکر ان کو گنوانا ایک علمی رسالہ میں موزوں نہیں۔

حاکم کی نفسیاتی مضرت، ملک کا نقصان اور دشمنوں کے خطرہ کے علاوہ یہاں کچھ گہری مضرتیں اور بھی ہیں جن کو

اس موجودہ مذاق کے لوگوں کے سامنے پیش کرنا ایک بڑی حقیقت کی ناقدری کرانیکے مرادف ہے اسلئے اسکو ذکر نہیں کیا جارہا ہے، اس رسالہ میں صرف اسی حد تک لکھا گیا ہے جسکو موجودہ دماغ کچھ نہ کچھ قبول کر سکے۔

حضرت عمرؓ کے اس فرمان میں یہ ہے کہ اسلام کا جماعتی نصب العین مال و دولت اور شان وشکوہ کی برتری نہیں بلکہ عمل و کردار میں سب سے بہتری ہے اور انسان کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی دوسرا نصب العین نہیں ہوسکتا، اسلئے فرمانِ مذکور میں اسی نصب العین کی رعایت کی گئی ہے کہ حکومت کا نشہ کہیں حکامِ زیرِ دست کو اعمال و کردار کی بہتری کے بجائے شان وشکوہ کی برتری میں مبتلا نہ کردے۔

حضرت عمرؓ نے یہ اُن حکام کو حکم دیا ہے کہ جو اُن کے کارندے ہوتے اور انکی نظروں سے غائب ہوکر دوسری خدمات پر مامور کئے جاتے تھے اگرچہ خود امیر المؤمنین عمرؓ نے مسلمانوں کے حاکمِ عام ہونیکے باوجود کسریٰ جیسے جبّار بادشاہ کیلئے بھی اپنی شانِ فقر کے سِوا کسی مصنوعی کرّ و فر کے دکھانیکا اہتمام نہیں فرمایا لیکن اس ملاقات کا رُعب

جوان بادشاہوں کے قاصدوں پر پڑتا تھا وہ تاریخوں میں آج بھی مُدَوَّن ہے اسکی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ اپنے بادشاہ میں مال ودولت کی برتری دیکھ کر آتے تھے اور جب حاکمِ اسلام کے سامنے پہنچتے تو یہاں ان کو عمل دکردار کی وہ بہتری نظر آتی تھی جسکو دیکھ کر انکی آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں اور اس کا اثر وہیبت انکے دلوں پر یہاں تک پڑتی تھی کہ بولنے میں بھی ان کو تکلف ہونے لگتا تھا۔ اس تمام تفصیل کو قرآن کریم کی ایک آیت میں اسطرح سمیٹ کر رکھ دیا گیا ہے اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عزت کا معیار تقویٰ یعنی اعمال کی برتری پر ہے۔

اس تمام گزارش کا مطلب یہ نہیں کہ موجودہ ترقی یافتہ دور میں بھی ہم کو کسی قسم کے ترفع کی ممانعت کی گئی ہے، بلکہ یہ بار بار تنبیہ کی جا چکی ہے کہ احادیث کے سمجھنے کے لئے اس وقت کا ماحول سامنے رکھنا ضروری ہے ورنہ اُن کے سمجھنے میں بہت سی بدگمانیاں بے وجہ پیدا ہو جاتی ہیں، خود امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں ایک باب یہ رکھا ہے

ہے "باب التجمل للوفود" یعنی آنحضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا باہر سے آنے والے وفود کے لئے ان کے اکرام میں اپنی عام عادت سے کچھ بڑھیا لباس زیبِ تن فرمانا، لیکن یہ کسی شان وشکوہ یا رُعب و دبدبہ کے اظہار کے لئے نہیں تھا "والعیاذ باللہ" بلکہ یہ اُس زمانہ کے ملوک اور سلاطین کا عام دستور تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ جو لوگ شرفِ ملاقات حاصل کریں ان کا اکرام کیا جائے اور آج بھی اُس قدیم عادت کے اثرات باقی ہیں، اگرچہ زاویۂ نظر بدل گیا ہے اسلئے اگر کسی صحیح مقصد کے پیشِ نظر اپنے دائرۂ وسعت میں رہ کر بیرونی حکام سے ملاقات کے لئے کوئی خاص انتظام کیا جائے تو اگر نیت صحیح ہو تو یہ شریعت کے عین منشا کے مطابق ہوگا لیکن اگر صرف اپنی شان وشکوہ کی نمائش کا تو لحاظ رہے اور اپنے اعمال کی برتری اور اخلاق کی بلندی کا کوئی لحاظ نہ رکھا جائے تو پھر یہ وہی باتیں ہیں جن کی روک تھام کی خاطر حضرت عمرؓ بہ نظرِ احتیاط اپنے حکام کو نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ مبادا کہیں وقتی جمال و تزئین مصلحت کی بجائے انکی عادت اور

طبعی خُو بن کر رہ جائے۔

حاکم کو چاہئے کہ وہ لوگوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرے اور سختی و درشتی کا معاملہ نہ کرے

(۱۱) عَنْ عَائِشَةَ رضؓ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَللّٰھُمَّ مَنْ وُّلِّیَ مِنْ اَمْرِ اُمَّتِیْ شَیْئًا فَشَقَّ عَلَیْھِمْ فَاشْقُقْ عَلَیْہِ وَمَنْ وُّلِّیَ مِنْ اَمْرِ اُمَّتِیْ شَیْئًا فَرَفَقَ بِھِمْ فَارْفُقْ بِہٖ۔ رواہ مسلم۔ مشکوٰۃ صفحہ ۳۲۱

ترجمہ: حضرت عائشہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ الٰہی میری امت میں سے جس کو بھی کسی شعبہ کی خدمت کا موقع ملے اور وہ لوگوں کے ساتھ سختی کا معاملہ کرے تو تُو بھی اسکے ساتھ سختی کا معاملہ فرمانا اور جو ان میں میری اُمت کے ساتھ نرمی کرے تو تُو بھی اسکے ساتھ نرمی کا معاملہ فرمانا۔

(۱۲) عَنْ عَائِشَةَ رضؓ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِدْرَؤُا الْحُدُوْدَ عَنِ الْمُسْلِمِیْنَ مَا اسْتَطَعْتُمْ فَاِنْ کَانَ لَہٗ مَخْرَجٌ فَخَلُّوْا سَبِیْلَہٗ فَاِنَّ الْاِمَامَ اَنْ یُّخْطِئَ

فِی الْعَفْوِ خَیْرٌ مِّنْ اَنْ یُّخْطِئَ فِی الْعُقُوْبَۃِ۔

رواہ الترمذی وقال قد روی عنہا ولم یرفع وھو اصح مشکوٰۃ صفہ ۳۱۱

ترجمہ: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکام کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ جہاں تک ممکن ہو حدود کے معاملہ میں مسلمانوں کے ساتھ وہ پہلو اختیار کرو جس میں وہ سرکاری مقرر کردہ سزا سے بچ جائے، تو اگر مقدمہ میں کوئی پہلو ملزم کی رہائی کا نکل سکتا ہو تو اسکی بنا پر ملزم کو رہا کردو، کیونکہ ملزم کو معاف کردینے میں امام کا غلطی کرنا غلط طور پر کسی غیر مجرم کو سزا دینے کے مقابلہ میں بہتر ہے۔

شرح: بارگاہِ رسالت کی دُور بین نظریں یہ دیکھ رہی تھیں کہ خلافتِ راشدہ کا دَور ہمیشہ قائم رہنے والا نہیں اور آئندہ چل کر حاکموں کے دماغ میں حکومت کا نشہ پیدا ہو جانا بعید نہیں اس لئے صحیح مسلم کی حدیث میں حکمرانوں کو متنبہ کیا ہے کہ اگر وہ اپنے عارضی دورِ حکومت میں میری اُمت کے ساتھ محض اپنی حکومت کے نشہ میں کوئی سختی کا معاملہ کرینگے تو میری بددعاء کے مستحق ہونگے، ظاہر ہے کہ آپ کے بددعائیہ کلمات کا اثر حکمرانوں کے دماغوں پر جتنا پڑ سکتا ہے اتنا اثر صرف ضوابط اور آئین کا نہیں پڑ سکتا۔

تعجب ہے کہ ایک شخص جو ابھی ہمارا بھائی بنا ہوا بیٹھا
تھا وہ اگر عارضی طور پر ہمارے انتخاب سے حکومت کی کرسی
پر جا بیٹھتا ہے تو اسکو یہ خیال باقی نہیں رہتا کہ وہ بہت
قلیل مدت کے بعد ضابطہ میں یا کسی حادثہ میں مبتلا ہو کر پھر
ہمارے ساتھ بیٹھنے والا ہے، اسلئے اسکو اپنے دورِ حکومت
میں اپنی اسلامی برادری کیساتھ کیسا سلوک کرنا چاہیئے؟ اگر شرعی
لحاظ سے یہ جذبہ دل میں پیدا نہیں ہوتا تو ایک ہوشمند دماغ
میں کم از کم عقلی لحاظ سے تو پیدا ہونا ضروری ہے۔

اسلام چاہتا ہے کہ حاکم و محکوم کے درمیان اصل رشتۂ الفت
و اخوت کسی حالت میں بھی ٹوٹنے نہ پائے لیکن نافہم ذرا سے
اقتدار کے حاصل ہو جانیکے بعد اس عمیق مصلحت کو فراموش
کر بیٹھتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اپنے دورِ حکومت میں غائبانہ
طور پر اہلِ معاملہ کی جانب سے بد دعائیں لیتے ہیں اور اپنے
عہدہ سے سبکدوشی کے بعد جب پھر واپس آتے ہیں تو عوام کی
نظروں میں اور زیادہ ذلیل و خوار ہوتے ہیں اور اس طرح
اتفاق و اتحاد اور الفت و اخوت کی جڑیں قوم میں سے اکھڑتی
چلی جاتی ہیں اور اسکے نتائج و اثرات شخصی نہیں رہتے بلکہ

قومی ابتری کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

دوسری حدیث محدثین کے نزدیک اگرچہ صحیح یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کا قول ہے تاہم اس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہی کہ حدود یعنی سرکاری سزاؤں کے معاملہ میں شریعت کا مقصد حتی الوسع اغماض و چشم پوشی کرنا ہے لیکن اگر کوئی قانونی پہلو نہ نکل سکتا ہو تو پھر ظاہر ہے کہ سزا کا حکم دینا یہ بہر حال تحفظِ قانون کیلئے ناگزیر ہے، یہاں جلد باز طبائع اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں کہ اس طریقہ سے کھلم کھلا جرائم کی کثرت ہو جائیگی کیونکہ ان حدیثوں کا منشاء اور ان کی اصل رُوح حکام کو جَور و ظلم سے روکنا ہے۔

اسلامی قانون سے نامانوس دماغوں کیلئے اس سے زیادہ تفصیل کرنی بھی ناکافی ہے اور حقیقت پسندوں کے سمجھنے کیلئے یہ چند کلمات بھی کافی ہیں۔

نوٹ: حدود سے مُراد یہاں قانون تعزیرات کا ایک خاص حصہ ہے جیسے حدِ زنا وغیرہ اس کی قدرے تفصیل آئندہ آئے گی۔

حاکم اگر خواہ مخواہ عوام کی عیب چینی کے درپے رہیگا تو اسکا نتیجہ عوام میں بددلی اور حکومت کی مخالفت کے سوا اور کچھ نہ ہوگا

(۱۳) عَنْ اَبِیْ اُمَامَۃَ رض عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِنَّ الْاَمِیْرَ اِذَا ابْتَغَی الرِّیْبَۃَ فِی النَّاسِ اَفْسَدَھُمْ۔

رواہ ابوداؤد۔ مشکوٰۃ صفحہ ۳۲۲

ترجمہ: ابوامامہ رض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ مسلمانوں کا حاکم جب اپنی رعایا کی عیب جوئی کے درپے ہو جائے تو سمجھ لو کہ وہ ان کو بگاڑ کر رہے گا۔

(۱۴) عَنْ مُعٰوِیَۃَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّکَ اِذَا اتَّبَعْتَ عَوْرَاتِ النَّاسِ اَفْسَدْتَّھُمْ

رواہ البیہقی فی شعب الایمان مشکوٰۃ صفحہ ۳۲۲

ترجمہ: حضرت معاویہ رض سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے میں نے خود سنا ہے کہ جب تم لوگوں کے عیب کے پیچھے لگے تو سمجھ لو کہ تم ان کو بگاڑ کر رہو گے۔

شرح: اصل بات یہ ہے کہ انسان ضعیف البنیان ہے اور
کمزوریوں کا مجموعہ ہے اسلئے ہر انسان میں اسکی زندگی کے
کسی نہ کسی گوشہ میں کوئی نہ کوئی کمزوری ضرور ہوتی ہے اب
حاکم اگر اسکے پیچھے لگا رہے کہ کرید کرید کر انسانی کمزوریوں
کو بر سرِ بام لاتا رہے تو اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ عوام اپنے
حاکم سے متنفر بن جائیں گے اور انتقامی جذبات سے بھر کر
اسکے درپے ہوں گے کہ خود اس حاکم کی کمزوریوں کو تلاش
کریں اور عوام میں ان کو افشاء کریں اور ضدی طبائع سے
یہ بھی بعید نہیں کہ وہ اپنے حاکم کی اس حرکت سے برافروختہ
ہو کر جن جرائم کا وہ پہلے ارتکاب نہ کرتے تھے انکا ارتکاب
کرنا شروع کر دیں یا کم از کم ان میں اور حد سے تجاوز کر جائیں
اس کا نتیجہ جو کچھ ظاہر ہوگا وہ ظاہر ہے۔

اسلئے حاکم کا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ جو چیز اسکے علم میں
آجائے اگر وہ جماعتی طور پر مضرت رساں ہو تو ایک لمحہ کیلئے
بھی اس سے درگذر نہ کرے اور اگر کوئی انفرادی تقصیر ہو
اور قابلِ اغماض ہو تو اس سے اغماض کر لے ہاں حاکم کا یہ
بھی فرض ہے کہ وہ اپنے زیرِ دست حکام اور رعایا کے عام

حالات سے صحیح صحیح طور پر باضابطہ مطلع رہنے کی سعی کرتا رہے تاکہ حاکم کی غفلت محکوموں کو حکومت کے مقابلہ میں دلیر نہ بنادے یہاں حدیث کا منشا صرف حاکم کو تنگ نظری سے اجتناب کرنے کی ہدایت کرنا منظور ہے اور شخصی کمزوریوں کے ہر وقت درپے رہنے سے ممانعت کرنا مدّ نظر ہے کیونکہ صحیح نظام اسی وقت تک قائم رہ سکتا ہے جب تک کہ حاکم لوگوں کے عیوب کے درپے بھی نہ ہو اور اسی طرح انکے حالات سے کلیتاً غافل بھی نہ رہے، یہ تو اصول ہے رہ گئے ہنگامی حالات تو ان کے احکام علیحدہ ہیں اس کا فرق ہر حکومت جانتی ہے اور اسکا لحاظ رکھتی ہے۔

جنکے ہاتھوں میں زمامِ حکومت ہو خُدائی قاہرانہ خوف کے سوا کوئی دُوسری طاقت انکو رام نہیں کر سکتی

(۱۵) عَنْ مَعْقَلِ بْنِ يَسَارٍ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَا مِنْ وَّالٍ يَلِيْ رَعِيَّةً مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ فَيَمُوْتُ وَهُوَ غَاشٌّ لَّهُمْ اِلَّا حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ۔

متفق علیہ مشکوٰۃ صفحہ ۳۲۱

ترجمہ: مَعْقِل بن یسارؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے خود سنا کہ جو حاکم بھی مسلمانوں کے کسی شعبہ پر مقرر ہو اور وہ ان کے ساتھ دھوکے اور کھوٹ کا معاملہ کرے اور اسی حالت پر اسکی موت آجائے تو اللہ تعالیٰ اپنی جنت کو اس پر حرام کر دیگا۔

شرح: قرآن و حدیث کا یہ عجیب اسلوب ہر جگہ قائم رہتا ہے کہ وہ عوام و خواص پر صرف ضوابط و آئین کا دباؤ نہیں ڈالتے بلکہ ایک ایسی طاقت کا خوف انکے دلوں پر مستولی رکھنا چاہتے ہیں جو حاضر و غائب یکساں ان پر قائم رہے آئین و ضوابط بہت ضروری چیزیں ہیں اور اسلام میں اپنے مفصل دفعات کے ساتھ موجود ہیں لیکن اگر انکے نافذ کرنے والے دماغ آزاد ہوں اور وہ کسی الٰہی یا کم از کم انسانی طاقت کا خوف اپنے دلوں میں نہ رکھتے ہوں تو خواہ انکی شکل کتنی ہی مکمل کیوں نہ ہو مگر وہ کچھ سود مند ثابت نہیں ہوتے حتیٰ کہ بعض مرتبہ غیر آئینی کارروائیوں کے لئے انسان کے بنائے ہوئے قوانین کے الفاظ میں ایسی وسعت رکھی جاتی ہے کہ بر وقتِ ضرورت ناجائز کارروائیوں کے لئے ان ہی ضوابط کے تحت کوئی نہ کوئی راہ کھل جاتی ہے اور اگر اس وسعت سے فائدہ نہ اٹھایا

جاسکے تو بعض دفعات کا اضافہ ایسا کر لیا جاتا ہے جو ان کی
اس ضرورت کو پورا کر دے لیکن اسلام زندگی کے کسی شعبہ
میں خواہ وہ شخصی ہو یا قومی کھوٹ رکھنا موجب ہلاکت سمجھتا ہے
اسلئے اسکے قوانین کا نگراں خود انسان کا ضمیر ہوتا ہے اور
اسکے قانون کی خلاف ورزی خود اسکے ضمیر کے لئے باعث
ملامت ہوتی ہے۔

رشوت شرعی نظر میں بہت بڑا سنگین جرم ہے اور اسکے حلال بنانے میں حیلے تراشنا یہ اسکو اور سنگین بنا دیتا ہے

(۱۶) عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو رض قَالَ لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی
اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الرَّاشِیَ وَالْمُرْتَشِیَ۔

رواہ ابوداؤد ورواہ احمد والبیھقی فی شعب الایمان عن
ثوبان وزاد "والرائش" یعنی الذی یمشی بینھما مشکوٰۃ صفحہ ۳۲۶

ترجمہ: عبداللہ ابن عمرو رض فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
رشوت دینے والے اور رشوت کھانے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے
اور کتب حدیث میں ثوبان رض سے اس شخص پر بھی لعنت مذکور ہے جو
درمیان میں رشوت کا معاملہ طے کرنے والا ہو۔

(١٧) عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ شَفَعَ لِاَحَدٍ شَفَاعَةً فَاَھْدٰی لَہٗ ھَدِیَّةً عَلَیْھَا فَقَبِلَھَا فَقَدْ اَتٰی بَابًا عَظِیْمًا مِّنْ اَبْوَابِ الرِّبٰا۔

رواہ ابوداؤد۔ مشکوٰۃ صفحہ ۳۲٦

ترجمہ: ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کسی نے کسی شخص کے معاملہ میں صحیح سفارش بھی کی اور اسکے بعد اسکے سامنے سفارش کرنے والے نے کوئی ہدیہ پیش کیا اور اس نے اس کو قبول کر لیا تو اس کو یاد رکھنا چاہئے کہ یہ بھی بڑی سودخوری کے برابر ہے۔

شرح: رشوت کی حرمت اور اسکی حیثیت مذکورۂ بالا ترجمہ سے ظاہر ہے اور اس کا حاصل یہ ہے کہ اس ایک جرم میں تین ۳ شخص مجرم قرار دئے جاتے ہیں اسلام میں جرائم کے انسداد کے لئے صرف قوانین کا وضع کر دینا یہ ناکافی سمجھا گیا ہے بلکہ اسکے ساتھ ذہنیت اور معاشرت کی تبدیلی پر بھی زور دیا گیا ہے اور انسان کے ضمیر پر ایک ایسی طاقت کا دباؤ ڈالا گیا ہے جو حاضر و غائب اسکے دل پر یکساں مستولی رہے اسی لئے قرآن کریم میں بہت سے مقامات میں آئین و ضوابط

کا تذکرہ فرما کر یا تو اِتَّقُوا اللّٰہ کا لفظ فرما دیا گیا ہے یا یہ تنبیہ
کی گئی ہے کہ جو کچھ تم کہتے یا کرتے ہو وہ پوشیدہ ہو یا علانیہ
ان میں سے کوئی بات ہمارے علم سے باہر نہیں رہتی وہ براہِ راست
بھی ہم سنتے اور جانتے ہیں اور ہماری سی۔ آئی۔ڈی کے دو
فرشتے تمہاری ایک ایک حرکت اور سکون کو ضبط تحریر میں
لاتے رہتے ہیں اور اس سے آگے بڑھ کر تمہارے اچھے بُرے
افعال خود تمہارے اعضاء میں ایسے اثرات چھوڑ جاتے ہیں
جو دنیا میں زبانِ حال سے اور آخرت میں زبانِ قال سے
ان پر شاہد ہوں گے، آج بھی ایک پولیس افسر ایک
مُشتبہ آدمی کو دُور سے دیکھ کر یہ تاڑ لیتا ہے کہ فلاں مال
کی چوری اسی نے کی ہے اور صرف اپنے تجربہ اور قیافہ شناسی
سے اسکو گرفتار کر لیتا ہے اس کا مطلب یہی تو ہے کہ اس کی
چوری کے اثرات کچھ نہ کچھ اسکے جسم اور چہرے سے نمایاں
ہونے لگتے ہیں تو پھر آپ کو اسی طرح انسان کے دوسرے
افعال کی شہادت میں آخرت کے دن شبہ کرنے کی وجہ کیا ہے،
شریعت میں لعنت وہ آخری لفظ ہے جو اللّٰہ تعالیٰ نے اپنی
مخلوق میں سب سے بڑھ کر راندۂ درگاہ کے لئے یعنی ابلیس شیطان

کے لئے استعمال فرمایا ہے، یہی لفظ رشوت کے معاملہ میں استعمال فرمایا ہے۔

اب اگر کسی کے دل پر اس آخری لفظ کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تو پھر وہ صرف قانون سے کیا متاثر ہو سکتا ہے حکومتیں یہاں کتنا غلط قدم اٹھاتی ہیں کہ خود حکام کی رشوت کی تحقیق کے لئے ایک دوسرا محکمہ قائم کرتی ہیں جس کا عنوان "اینٹی کرپشن" (ANTI-CoRRUPTION) ہے اس کا حاصل عوام کے حق میں صرف یہ نکلتا ہے کہ پہلے جو رشوت ایک جگہ دی جاتی تھی اب دو جگہ دینی پڑتی ہے اور یہ کوئی نہیں سوچتا کہ اگر اینٹی کرپشن کے افسران قابلِ اعتماد ہیں تو ان ہی کو اصل حاکم کیوں مقرر نہیں کیا جاتا، اس محکمہ کی وجہ سے پہلے افسران کے اوپر فطرتاً یہ اثر پڑتا ہے کہ جب ہم حکومت کی نظر میں یُوں بھی رشوت خور ہو سکتے ہیں پھر کیوں ہم رشوت لینا شروع نہ کر دیں یعنی ان کی ذہنیت خود بخود مجرمانہ بن جاتی ہے۔

میں نے یہ خود سنا ہے جب رشوت کی سزا اور تحقیق میں زیادہ شدت ہونے لگتی ہے تو رشوت خور افسران یہ کہہ کر رشوت کا بھاؤ اور گراں کر دیتے ہیں کہ بھئی اب تو رشوت

لینا بڑا خطرہ مول لینا ہے اسلئے سو کے بجائے ہزار دلواؤ تو
کام ہو، اس لئے لازم ہے کہ جب تک ہماری ذہنیت
تبدیل نہ ہو اور ہمارے معاشرہ میں تبدیلی پیدا نہ ہو
اس وقت تک جرائم کا انسداد ناممکن ہے، انسانی جبر و تشدد
صرف ایک حد تک کام کر سکتا ہے لیکن اندر اور باہر انفرادی
اور اجتماعی زندگی میں جو چیز مؤثر ثابت ہو سکتی ہے وہ
صرف ایک "خوفِ خدا" ہے جو صرف دینی تعلیم سے نہیں
بلکہ دینی تربیت سے نصیب ہوتا ہے ورنہ بعض مرتبہ تعلیم
کے نتیجہ میں انسان اور پڑھا ہوا جن بن جاتا ہے اور وہ
اَن پڑھ جِن سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتا ہے کیونکہ وہ
جرائم کو فلسفیانہ طریقہ سے کرنیکا عادی ہو جاتا ہے یعنی
رات کی تاریکی کے بجائے دن کی روشنی میں کار پر بیٹھ کر
سرکاری وردی کے بھیس میں جرائم کا ارتکاب کرتا ہے،
اسلئے جب تک دینی تربیت نصیب نہ ہو اس وقت تک
رشوت کے انسداد کے لئے صرف آئین کا وضع کر دینا کافی
نہیں ہے بلکہ اسکے ساتھ اسکی سعی کرنی بھی ضروری ہے کہ جس
ذریعہ سے ممکن ہو ہمارے قلوب پر حاضر و غائب کسی ذات

کا خوف مستولی رہے اور آپ اپنی اصطلاح میں اس کا نام جو
چاہیں رکھیں مگر اسلام میں اس کا نام "تقویٰ اللہ" ہے
رشوت کی حقیقت ٹھیک وہ ہے جو چوری کے مال کی ہوتی
ہے بلکہ اس سے بڑھ کر کھلم کھلا لوٹ کے مال کی ہے، اور.
اس پر طرہ یہ کہ لوگوں نے اس کا نام "حق" رکھا ہے اور
وہ اسی لفظ سے کہکر وصول کیا جاتا ہے کہ ہمارا "حق" دلوایئے
یہ مال جس طرح وصول ہوتا ہے اس سے پہلے رشوت دینے
والا دفتر سے باہر کھڑے ہو کر ماں اور بہن کی گالیاں دے کر
مجبوراً اس مال کو ادب سے پیش کرتا ہے اور باہر نکل کر خود
اس کو اور اسکے بچوں کو کڑھ کڑھ کر بد دعائیں دیتا ہے،
شرح السنّہ میں ابو حمید ساعدیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے مالِ زکوٰۃ وصول کرنے پر ایک شخص
کو مقرر فرمایا لوگوں نے اپنے مالوں کی زکوٰۃ بھی اس کو دی اور
اسکے علاوہ اسکو بھی کچھ ہدیہ پیش کیا، لیکن وہ ایمانداری
کا دور تھا اسلئے اس نے ان دونوں مالوں کو علیحدہ علیحدہ
رکھا اور آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر صاف صاف بات
کہہ دی کہ یہ مال تو زکوٰۃ کا ہے اور یہ مجھ کو بطور ہدیہ پیش

کیا گیا ہے، آپ کو اس کی اتنی اہمیت محسوس ہوئی کہ آپنے اس واقعہ کا تذکرہ منبر پر تشریف لاکر فرمایا اور بڑی ناگواری کے ساتھ یہ جملہ ارشاد فرمایا کہ میں لوگوں کو زکوٰۃ وصول کرنے کے لئے بھیجتا ہوں اور واپس آکر وہ مجھ سے یہ کہتے ہیں کہ یہ تو زکوٰۃ کا مال ہے اور یہ ہمکو ملا ہے اگر یہ اپنے ماں باپ کے گھر بیٹھے رہتے تو پھر دیکھتے بھلا کون آ آکر ان کو یہ ہدیہ پیش کرتا ہے، اسکے بعد آپنے اس خطبہ میں اور بہت سی باتیں اپنی ناگواری کی ذکر فرمائیں، دیکھو مشکوٰۃ شریف صفحہ ۱۵۷ (کتاب الزکوٰۃ) اس روایت کی روشنی میں جو حکام طرح طرح کے حیلے بہانے بنا کر حرام رشوت کو حلال بنانا چاہتے ہیں وہ اپنے دل میں خود ہی اس کا فیصلہ کرلیں۔

حضرت ابو امامہؓ کی دوسری حدیث بھی سامنے رکھئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ حاکم کے لئے رشوت خوری سے بچنے کے لئے کتنی باریک بینی کی ضرورت ہے اسلئے اگر آپ اسلامی نقطۂ نظر سے حرام مال سے بچنا چاہتے ہیں یا موجودہ اصطلاح میں قوم کی خدمت چاہتے ہیں تو بے وجہ رشوت کو حلال بنانے کی کوشش نہ فرمائیے اور اس مغالطہ میں نہ رہیئے

کہ اگر منہ پر آپ کو کوئی رشوت خور نہیں کہتا تو عوام میں بھی
آپ معصوموں کی فہرست میں شمار ہونگے یا اگر حکومت آپکو
گرفت میں لا نہیں سکتی یا مصلحتاً اس سے اغماض کرتی ہے
تو خدائی گرفت کے پنجہ سے آپ نکل سکتے ہیں، خوب یاد رکھئے
کہ اس کا خمیازہ آج نہیں تو کل آپ کو بھگتنا ہوگا۔
اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ (بیشک تیرے رب کی پکڑ
سخت ہے) (پارہ ۳۰ رکوع ۱۰)

حکومت ابتدا میں بہت خوبصورت نظر آتی ہے لیکن انتہا میں باعثِ ندامت ہوتی ہے

(۱۸) عَنْ اَبِی هُرَيْرَةَ رض عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
قَالَ اِنَّكُمْ سَتَحْرِصُوْنَ عَلَى الْاِمَارَةِ وَسَتَكُوْنُ نَدَامَةً
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَنِعْمَ الْمُرْضِعَةُ وَبِئْسَتِ الْفَاطِمَةُ۔

رواہ البخاری مشکوٰۃ صفحہ ۳۲۰

ترجمہ: ابوہریرہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ
آپ نے فرمایا کہ ایک وقت ایسا آنے والا ہے جبکہ تم امیر بننے کی حرص کروگے
حالانکہ تمہارے لئے امارت و حکومت قیامت میں باعثِ ندامت ہوگی

اور حکومت کی مثال ایسی ہے جیسا کہ ایک دودھ پلانے والی
عورت کی کہ ابتدا میں تو بڑی پیاری لگتی ہے اور جب دُودھ
چھڑانے لگتی ہے تو وہی بہت بُری لگنے لگتی ہے (یہی حالت
حکومت کی ہے کہ ابتدا میں حکومت بہت دلفریب نظر آتی ہے
لیکن جب اسکے نتائج سامنے آتے ہیں تو وہی بہت خوفناک بنجاتی ہے)
شرح: حکومت کی ابتدائی دلفریبی اور پھر اسکے عواقب
کی بدنمائی جن اعتبارات سے شرعی نظر میں ہے ان کو آخرت
سے غافل دماغوں کو سمجھانا بہت مشکل ہے لیکن سطحی طور پر
جو بات موجودہ دماغوں میں آسکتی ہے وہ اتنی واضح ہے
کہ کسی زیادہ غور و فکر کی محتاج نہیں بلکہ آنکھوں سے دنیا
کے موجودہ واقعات دیکھ کر نظر آرہی ہے، ایک حکمران جب
تختِ حکمرانی پر بیٹھا ہے تو ابھی وہ جم کر بیٹھنے بھی نہیں پاتا
کہ موت اسکے سر پر منڈلانے لگتی ہے، یہ تو ہیں زمانہ کے
انقلابات اور لوگوں کی بے عقلی کے ثمرات، لیکن اگر ان سے
قطع نظر کرلی جائے تو پھر بھی ایک حاکم کا یہ فرض ہے کہ وہ
انصاف کے ساتھ یہ سوچے کہ کتنے لوگوں کی زندگی اور راحت
کی ذمہ داری اسکے سر پر عائد ہوتی ہے جس سے موجودہ دَور

میں عُہدہ برآ ہونا کوئی کھیل تماشہ نہیں ہے۔

اگر حکومت انسانوں کی جان و مال سے کھیلنے کا نام ہو جیسا کہ موجودہ لوگوں کی ذہنیت بن گئی ہے تو یہ بات تو دوسری ہے لیکن اگر اسپر غور کیا جائے کہ ایک گھرانے کے والدین پر اپنے بچوں کی صحت، انکی غذا، انکی رہائش، ان کی تعلیم و تربیت کی کتنی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور صحیح طور پر ان کو انجام دینا ان کو کتنا مشکل ہوتا ہے تو صرف یہی نہیں بلکہ ان سے کہیں بڑھ کر نازک ذمہ داریاں چند افراد کی نہیں بلکہ کروڑوں انسانوں کی اسکے سر عائد ہو جاتی ہیں، ان سب کو کامیاب طریقہ پر پورا کرنا کیا کوئی آسان بات ہے۔ لیکن حکومت کی چاشنی اور اقتدار کی ہوس ان سب کو ایسا فراموش کر دیتی ہے کہ گویا خدا کی مخلوق کی قسمت کا فیصلہ ان کے ہاتھوں میں ہے جس کو وہ اپنی مرضی کے مطابق بدلکر اپنے مغرور نفس کو خوش کرتے رہتے ہیں، کیا حکومت اس کا نام ہے؟ اسلام کا نہیں بلکہ انسانیت اور شرافت کا تقاضا یہی ہے، خوب یاد رکھئے کہ ایک حاکم کے بننے اور بگڑنے سے ایک ملک کا بگڑنا یا سنور جانا ہے، اگر سنور گیا تو اس سے

بڑھ کر خوش قسمت کون ہے اور اگر بگڑ گیا تو اُس بدنصیب پر اسکے مرنے کے بعد بھی تاریخ لعنت کرتی رہتی ہے اسلئے عاقل شخص کب اتنی بڑی ذمہ داریوں کو خوشی کے ساتھ اپنے سر لے سکتا ہے، جن کی ادائیگی یقیناً انسان کے بس سے باہر ہے۔

یہاں یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ ایک شوہر جو اپنی چند بیویوں پر صرف ایک ادنیٰ درجہ کی حکومت رکھتا ہے جب وہ اس کو ادا کرنے سے قاصر رہ سکتا ہے تو پھر یہ کتنا مشکل ہوگا کہ ایک حاکم عام کروڑوں انسانوں کے حقوق ادا کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ اس لئے اسلام میں حکومت کا سب سے زیادہ نااہل وہ شخص ہے جسکے دل میں حکومت کی سب سے زیادہ ہوس ہو۔

اسلام میں حکومت کا سب سے زیادہ نااہل شخص وہ ہے جس میں اقتدار کی سب سے زیادہ ہوس ہو

(۱۹) عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی رضؓ قَالَ دَخَلْتُ عَلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَا وَرَجُلَانِ مِنْ بَنِیْ عَمِّیْ فَقَالَ اَحَدُھُمَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَمِّرْنَا عَلٰی بَعْضِ مَا وَلَّاکَ اللّٰہُ وَقَالَ الْاٰخَرُ مِثْلَ ذٰلِکَ

فَقَالَ اِنَّا وَاللّٰهِ لَا نُوَلِّیْ عَلٰے هٰذَا الْعَمَلِ اَحَدًا اَسَأَلَهٗ وَلَا اَحَدًا اَحْرَصَ عَلَیْهِ وَفِیْ رِوَایَةٍ قَالَ لَا نَسْتَعْمِلُ عَلٰی عَمَلِنَا مَنْ اَرَادَهٗ۔ متفق علیہ مشکوٰۃ صفہ ۳۲۰

ترجمہ: ابوموسیٰ رضؓ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا میں تھا اور میرے ساتھ میرے دو چچازاد بھائی تھے ان میں سے ایک نے عرض کی یا رسول اللہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکمران بنایا ہے اسکے کسی حصہ پر ہمیں بھی حاکم بنا دیں اور دوسرے نے بھی یہی درخواست کی اس پر آپ نے ناگواری سے فرمایا خدا کی قسم جو شخص بھی ہم سے حکومت کا طلبگار ہوگا یا اس پر حریص نظر آئیگا ہم اسکو ہرگز حاکم نہیں بنائیں گے ایک روایت میں یوں ہے جو شخص خود کارندہ بننے کا طالب ہو ہم اس کو اپنا کارندہ مقرر نہیں کرینگے۔

(۲۰) عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ سَمُرَةَ رضؓ قَالَ قَالَ لِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لَا تَسْأَلِ الْاِمَارَةَ فَاِنَّكَ اِنْ اُعْطِیْتَهَا عَنْ مَّسْئَلَةٍ وُّكِلْتَ اِلَیْهَا وَاِنْ اُعْطِیْتَهَا عَنْ غَیْرِ مَسْئَلَةٍ اُعِنْتَ عَلَیْهَا۔ متفق علیہ مشکوٰۃ صفہ ۳۲۰

ترجمہ: عبدالرحمٰن بن سمرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے نصیحت فرمائی کہ دیکھنا حکومت کی خواہش کبھی نہ کرنا کیونکہ اگر

خود سوال کرنیکے بعد تم کو حکومت مل گئی تو خدائی اعانت تمہارے ساتھ نہ ہوگی اور تم کو خود ہی سنبھالنی پڑے گی اور اگر بے مانگے ملی تو اسکے نظام میں خدا تعالیٰ تمہاری مدد فرمائے گا۔

شرح: اس حدیث سے اوپر کی حدیث کی شرح خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے اور یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ جو شخص خود طالب حکومت ہو اسکو شرعاً حاکم بنانا کیوں ناپسندیدہ سمجھا گیا ہے اور اسکا خلاصہ یہ ہی کہ حکومت اتنی بڑی ذمہ داری ہی جسکو انسان اپنے ضعیف ہاتھوں سے کبھی انجام نہیں دے سکتا جبتک کہ اسکی پشت پر خدائی طاقت نہ ہو اسکو صرف ایک مولویانہ بات نہ سمجھئے بلکہ کسی جہاز کے کپتان سے پوچھکر دیکھ لیجئے جو قسم قسم کے آلات کے باوجود جب سمندر میں اپنے جہاز کو چلاتا ہے تو اسکا تعلق خواہ کسی مذہب سے ہو مگر اسکی نظر ہمیشہ قدرتِ الٰہیہ پر لگی رہتی ہی کیونکہ اپنی آنکھوں سے وہ یہ دیکھتا رہتا ہے کہ اب اسکا معاملہ خدا تعالیٰ کی اتنی بڑی زبردست مخلوق کے ساتھ ہے کہ اسکے بڑے سے بڑے جہاز کی حیثیت اسکے مقابلہ میں ایک تنکے کے برابر بھی نہیں بیشک وہ آلات کے ذریعہ یہ پہچان لیتا ہے کہ طوفان فلاں سمت سے آرہا ہے

اور کتنی رفتار کیساتھ آرہا ہے لیکن ابھی تک کوئی آلہ ایسا ایجاد
نہیں ہوا جو اس آنیوالے طوفان کا رُخ اسکے جہاز کی جانب سے
بدلکر دوسری جانب کر سکے اسلئے وہ جانتا ہے کہ ہر قسم کے آلات
کے باوجود نجات مشکل ہے اور اسلئے اسکی نظر ہمیشہ زبردست قدرت
پر لگی رہتی ہے، اسی طرح جو شخص حکومت کو از خود طلب کرتا ہے
اسکو سمجھنا چاہیئے کہ وہ کتنی مختلف طبائع اور کتنے مختلف المزاج
لوگوں کی ذمہ داریاں اٹھا سکتا ہے اور اکثر حالات میں ممکن
ہے بالخصوص ہمارے دور میں کہ کسی سمت سے بھی اور کسی وقت
بھی اچانک انسانوں کے جذبات کا طوفان اٹھ کھڑا ہو تو کیا
اسکے دست وبازو میں اتنی طاقت ہے کہ وہ اسکا مقابلہ خود کر سکتا ہے

اسلامی قانون میں ظاہری نظام کیساتھ ہر ہر موقع پر اسکا
رشتہ کہیں باطنی نظام سے کٹا ہوا نظر نہیں آئیگا اور یہی مسلمانوں
کی اور اسلامی قانون کی بڑی روح ہے جو آج ہمارے موجودہ
دماغوں سے نکل چکی ہے مثلاً آفتاب اور مہتاب کا طلوع اور
غروب ہونا یہ قدیم فلسفہ میں حرکتِ فلک اور خود ان سیّارات
کی حرکت کا نتیجہ تھا اور موجودہ زمانہ میں یہ سب کچھ زمین کی
حرکت سے متعلق ہے اسلامی نقطۂ نظر میں ان دونوں باتوں

میں سے کسی ایک جانب پر زور نہیں دیا گیا لیکن یہ ضرور بتایا گیا ہے کہ اتنے بڑے بڑے سیّارات خواہ کتنے ہی اسبابِ ظاہری کے ساتھ مربوط نظر آئیں لیکن باطنی نظر میں ان پر خدا کا ایک زبردست فرشتہ بھی مقرر ہوتا ہے جسکے ہاتھوں میں وہ مسخر ہوتے ہیں جیسا کہ آجکل جو روکٹ (ROCKET) آسمان کی جانب چھوڑے جاتے ہیں انکے ساتھ ایسے آلات بھی رکھے جاتے ہیں جو انکو مختلف طبقات سے گذرنے میں مدد دیں اور اگر وہ اپنا راستہ بدلیں تو یہ کوشش کیجاتی ہے کہ ریڈیائی لہروں کے ذریعہ حتی المقدور انہیں اپنے راستوں پر قائم رکھا جائے مگر اتنی ترقیات کے باوجود ابھی اس بارے میں صحیح کامیابی نہیں ہوسکی تو پھر قدرت بھی اگر ان دو زبردست سیّاروں کو اپنے اپنے مدار پر گھومنے کیلئے کوئی فرشتہ متعین کردے تو اس پر ہنسی اڑانا یہ عقل کی بات نہیں بلکہ بے علمی کی بات ہے، پھر ضعیف الانسان کی کیا طاقت ہے کہ وہ بھاری بھاری ذمہ داریوں کے اٹھانے کے لئے حریص بن جائے، بس یہی ایک بات اس کی نا اہلیت کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔

~~~ ⁂ ⁂ ⁂ ~~~
~~~

اپنی قابلیت سے بڑھ کر کسی ذمہ داری کا اپنے سر لینا ذلّت کا پیش خیمہ ہے

(۲۱) عَنْ حُذَیْفَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یَنْبَغِیْ لِلْمُؤْمِنِ اَنْ یُّذِلَّ نَفْسَہٗ قَالُوْا وَکَیْفَ یُذِلُّ نَفْسَہٗ قَالَ یَتَعَرَّضُ مِنَ الْبَلَاءِ لِمَا لَا یُطِیْقُ۔

رواہ الترمذی وابن ماجۃ والبیہقی فی شعب الایمان مشکوٰۃ صفحہ ۲۱۴

ترجمہ: حضرت حذیفہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مؤمن کیلئے یہ مناسب نہیں کہ وہ اپنے نفس کو ذلیل کرے، صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا بھلا اپنے نفس کو کوئی کیسے ذلیل کر سکتا ہے فرمایا ایسا بار اٹھا لینا جسکے اٹھانیکی اسمیں طاقت نہ ہو (یہ ذلیل ہی کرنا ہے)

فائدہ: صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دماغ فطرتاً ہی بلند تھے، پھر اسلام نے آکر انکو اور اتنا بلند کر دیا تھا کہ ان کے فہم میں اپنے نفس کے ذلیل کرنے کی کوئی صورت ہی نہ آسکی، آپ نے ان کو بتایا کہ کبھی عزت کے کام میں بھی ذلّت کا خمیازہ بھگتنا پڑ جاتا ہے، براہِ راست ذلت کے کاموں سے بچنا سب جانتے تھے لیکن خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک قدم اور

آگے بڑھا کر سمجھایا کہ ایسے عزت کے کاموں میں پھنسنا جن کا انجام ذلّت ہو یہ بھی مؤمن کا کام نہیں، پھر معلوم نہیں ذلت کا جو تعلق یہود کے ساتھ تھا وہ مسلمانوں نے اپنے ساتھ کیسے رکھا ہے، اگر اقتدار کی ہوس رکھنے والے اس نکتے کو سمجھ لیتے تو شاید ہر دانا شخص اس سے بچنے کی کوشش کرتا اسکی تفصیل جواہر الحکم حصہ دوم میں ملاحظہ فرمائیے۔

غیر محقّق باتوں کا غیر ذمّہ دارانہ طور پر نقل کرنا بھی اسلام میں ایک بڑا عیب شمار ہوتا ہے

(۲۲) عَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدِنِ الْاَنْصَارِیِّ رض قَالَ لِاَبِیْ عَبْدِ اللّٰہِ اَوْ قَالَ اَبُوْ عَبْدِ اللّٰہِ لِاَبِیْ مَسْعُوْدٍ مَا سَمِعْتَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ فِیْ زَعَمُوْا قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ بِئْسَ مَطِیَّۃُ الرَّجُلِ

رواہ ابوداؤد وقال ان اباعبد اللہ حذیفۃ مشکوٰۃ صفہ ۲۶۳

ترجمہ: حضرت ابومسعود اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہما نے باہم ایک گفتگو میں یہ سوال کیا (راوی کو شک ہے کہ یہ سوال کس نے کیا۔ ابومسعود رضی اللہ عنہ نے حذیفہ رضی اللہ عنہ سے یا حضرت حذیفہ نے ابومسعود رضی اللہ عنہ سے)

کہ آپ نے کلمہ زَعَمُوْا (لوگوں کا گمان ہے) کے استعمال کے متعلق رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کیا سنا ہے، انہوں نے جواب دیا کہ یہ کلمہ بے تحقیق باتوں کے چلتا کرنے کا بہت بُرا طریقہ ہے۔

شرح: ابن قتیبہ نے "مختلف الحدیث" میں اور امام طحاوی نے "مشکل الآثار" میں اس روایت پر طویل کلام کیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب تک کسی بات کا خود یقین حاصل نہ ہو جائے اسوقت تک صرف اپنی گردن رہا کرنیکے لئے اسکو لوگوں کیطرف نسبت کر کے بیان کر دینا شریعت کی نظر میں یہ بھی قابلِ مواخذہ ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کذب اور جھوٹ اڑانے کی اہمیت شرعی نظر میں کتنی ہوگی، اگر صرف اسی حدیث پر عمل کر لیا جائے تو آج بے سروپا خبروں کے پھیل جانے کی وجہ سے جو بے بنیاد فتنے مسلمانوں میں پیدا ہو جاتے ہیں اور حکومتوں کیلئے باعثِ تشویش اور مسلمانوں میں باعثِ تفریق بن جاتے ہیں وہ ہرگز نمودار نہ ہوں۔

قرآن مجید نے بھی بے تحقیق خبروں کو قبول نہ کرنیکی اہمیت ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے:۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْۤا اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ

فَتُصْبِحُوا عَلٰی مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ ط (اے ایمان والو اگر آئے تمہارے پاس کوئی گنہگار خبر لے کر تو تحقیق کر لو کہیں جا نہ پڑو کسی قوم پر نادانی سے پھر کل کو اپنے کئے پر لگو پچتانے) (پارہ ۲۶ رکوع ۱۳)

آیت بالا میں یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ اکثر نزاعات و مناقشات کی ابتدا چونکہ جھوٹی خبروں سے ہوتی ہے اسلئے اختلاف و تفریق کے اس سر چشمہ کو بند کرنے کے لئے یہ تعلیم دی گئی ہے کہ کسی خبر کو یوں ہی بلا تحقیق نہ مانا کرو بلکہ پہلے اچھی طرح اسکی تحقیق کر لیا کرو ورنہ بسا اوقات بعد میں تم کو پشیمانی اٹھانی پڑے گی۔

پارٹی بندی اور گروہ بندی کیلئے اسلامی معاشرت میں کوئی جگہ نہیں ہے

(۲۳) عَنْ عَمْرِو بْنِ شُعَیْبٍ عَنْ اَبِیْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ خَطَبَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَامَ الْفَتْحِ ثُمَّ قَالَ اَیُّهَا النَّاسُ اِنَّهٗ لَا حِلْفَ فِی الْاِسْلَامِ وَمَا کَانَ مِنْ حِلْفٍ فِی الْجَاهِلِیَّةِ فَاِنَّ الْاِسْلَامَ لَا یَزِیْدُهٗ اِلَّا شِدَّةً۔

رواہ ابوداؤد مشکوٰۃ صفحہ ۳۰۳

ترجمہ: عمرو ابن شعیب اپنے والد سے وہ اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن یہ اعلان فرمایا کہ آج سے اسلام میں دوستی کا عقد کوئی چیز نہیں، جو عقد زمانہ جاہلیت میں قائم ہو چکا ہے تو اسلام اس کا مخالف نہیں بلکہ اسکو اور مضبوط کرتا ہے۔

شرح: اسلام سے قبل عرب کا تمام ملک پارٹیوں اور قبائل میں بٹا ہوا تھا، گھر گھر میں اختلافات اور قبیلہ قبیلہ میں جنگ و جدال چھڑا رہتا تھا، اسلام نے انکے بعد جن نعمتوں سے انکو سرفراز کیا اسمیں سے ایک نعمت عظمیٰ اتفاق کی نعمت تھی، اسی کی طرف اشارہ ہے:۔ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ط (اور یاد کرو احسان اللہ کا اپنے اوپر جب کہ تم تھے آپس میں دشمن پھر اُلفت دی تمہارے دلوں میں اب ہو گئے اسکے فضل سے بھائی) (پارہ ۴ رکوع ۲)

عرب ان ہی اختلافات کی وجہ سے ہر وقت خوف و ہراس کی زندگی بسر کیا کرتے تھے اسلئے ان کو اسکی ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ ہر قبیلہ کسی دوسرے قبیلہ کیساتھ محبت کا ایسا مضبوط عقد باندھے جو دوستی و دشمنی کے وقت اسکے کام آئے اور اسی کو وہ عقدِ محالفت سے تعبیر کرتے تھے اسکا نتیجہ یہ ہوتا تھا

کہ اگر ایک حلیف کسی کو قتل کر دیتا تو اسکے جرم میں اسکے دوسرے
حلیف شخص کو جو مجرم نہ ہوتا گرفتار کر کے اس وقت کے دستور
کے موافق سزا دی جاسکتی تھی گویا اس طرح یہ تعاون جنگ و جدال
کے لئے ایک تعاون تھا۔

آنحضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ میں جن
جن اہم باتوں کا اعلان فرمایا ان میں سے اس غلط عقد مخالفت
کی تردید بھی تھی اور خلاصۂ کلام یہ تھا کہ اسلام اس قسم کی گروہ بندی
اور پارٹی بندی کا سرے سے مخالف تھا اب رہا امورِ خیر میں
پارٹیاں بنانا اور اس بارے میں کوئی جدید عقد کرنا تو اسکی اسلئے
کوئی ضرورت نہیں ہے کہ اس عقد کا جو کچھ تقاضا ہو سکتا تھا
اس سے بڑھ کر تقاضا خود اسلامی اخوت کا ہے، اسلئے اسلامی
معاشرت میں پارٹی بندی کیلئے کوئی جگہ نہیں ہے، نہ موافق اور نہ مخالف۔

موجودہ حکومتوں میں مخالف پارٹی کا وجود لازمی قرار دیا
گیا ہے وہ کن اسباب کی بنا پر ہے وہ اسوقت کا تعلیم یافتہ طبقہ
سب جانتا ہے، لیکن میرے نزدیک اسکی حقیقت صرف نقالی
اور ترقی یافتہ اقوام سے مرعوبیت کے سوا کچھ نہیں، ان
صاحبان نے اس طرف تو توجہ کی کہ ترقی یافتہ ملکوں

میں مخالف پارٹی کا وجود کس قدر ضروری سمجھا گیا ہے مگر اس کا دوسرا پہلو بالکل نظر انداز کر دیا یعنی یہ کہ وہ کس ماحول میں اور کس معاشرت میں اور کن نظریات کے ماتحت حکومت کو ہوشیار رکھنے کیلئے ضروری سمجھا گیا ہے کیا نیم ترقی یافتہ ملکوں میں اسکی استعداد اور اہلیت موجود ہے یا نہیں ؟ اگر آپ انصاف کرینگے اور دیگر قوموں کی نقّالی سے علیحدہ ہو کر مخالف پارٹی کے عنوان ہی کو سوچیں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اعضائے حکومت میں اختلاف ڈالنے کیلئے یہ عنوان ہی کافی ہے اور اس عنوان کی وجہ سے اسکی ذہنیت فطرتاً یہ بن جانی ضروری ہے کہ وہ موافق پارٹی کی تجاویز میں کوئی نہ کوئی قانونی سقم نکالتا رہے اسکا دوسرا رُخ یہ ہے کہ موافق پارٹی فوراً اس سقم کی جوابدہی کے درپے ہو جاتی ہے اور اس تحزب کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حقیقت بینی کے بجائے پارٹی بندی کی روح کام کرنے لگتی ہے، لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ مسلمانوں کی فلاح وبہبود کس صورت میں ہے وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ہماری پارٹی کے غلبہ کی صورت کیا ہے، اس لئے اسلام پارٹی بندی سے بالاتر ہونیکی تعلیم دیتا ہوا وہ ارکینِ حکومت

یں سے ہر رکن کے دماغ پر یہ زور ڈالتا ہے کہ وہ خود اپنے ضمیر
یں اس عظیم مقصد کے لئے موافق اور مخالف پہلوؤں پر
غور کرے، لیکن اگر ہماری فطرت ہی اتنی پست ہوچکی ہے کہ
ہم اسلامی فلاح و بہبود کی بجائے اپنی شخصیت کا تحفظ اور
بلندی چاہتے ہیں تو پھر مخالف پارٹی بندی کا اکھاڑا بنانے سے
بھی کوئی مستقل فائدہ نہیں ہوسکتا، اسلام کی روح یہ ہے کہ
مسلمانوں کی جو خدمت کی جائے وہ خلوص پر مبنی ہو اور لوجہ اللہ
ہو اور اسمیں کسی کی رعایت، مخالفت و موافقت، خوشامد اور
خوف کا کوئی تصور بھی نہ آئے، حکومت کی جو پارٹی بھی ہو ان
یں ہر ایک فرد کا یہ فرض ہے کہ جو فرائض مخالف پارٹی کے
ہوتے ہیں وہ خود اسکو انجام دے، بلا لحاظ اسکے کہ اکثریت
کس طرف ہو اور اقلیت کسطرف، اور اگر ہمارا مقصد ایک ہو
تو اسکو جتنا ہم صحیح طور پر متحد ہوکر سوچ سکتے ہیں، اختلاف
کی صورت میں فطرتاً اتنا صحیح نہیں سوچ سکتے، اس غلط
رسم کے پڑجانے کے بعد اگر یہ بات آپ کی سمجھ میں نہ آسکے تو
یہ بات دوسری ہے۔

مسلمان کو چاہئے کہ وہ صحیح بات پر مضبوطی کیساتھ قائم رہے اور عوام کے ہر شور و شر کی شرکت سے احتراز کرنا لازم سمجھے

(۲۴) عَنْ حُذَيْفَةَ رضـ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا تَكُوْنُوْا اِمَّعَةً تَقُوْلُوْنَ اِنْ اَحْسَنَ النَّاسُ اَحْسَنَّا وَاِنْ ظَلَمُوْا ظَلَمْنَا وَلٰكِنْ وَطِّنُوْا اَنْفُسَكُمْ اِنْ اَحْسَنَ النَّاسُ اَنْ تُحْسِنُوْا وَاِنْ اَسَاءُوْا فَلَا تَظْلِمُوْا۔

رواہ الترمذی، مشکوٰۃ صفحہ ۴۳۵

ترجمہ: حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بے سوچے سمجھے ہر شور و شر میں پبلک (PUBLIC) یعنی عوام کے ساتھ شریک ہونیکی عادت چھوڑ دو یعنی یوں مت کہا کرو کہ اگر لوگ کوئی اچھا کام کرینگے تو ہم بھی وہی کام کرینگے اور اگر لوگ غلط راہ چلکر ظلم کرینگے تو ہم بھی انکے ساتھ اسمیں انکے شریک رہینگے تم کو چاہئے کہ تم خود اپنی ایک صحیح رائے قائم کرو اور ان بے علمی کی باتوں کی بجائے یہ کرو کہ اگر لوگ بھلا کام کریں تو تم انکے ساتھ اسمیں ضرور شریک ہو اور اگر وہ کوئی غلط راستہ اختیار کریں تو انکے ساتھ برائی میں ہرگز شرکت مت اختیار کرو۔

شرح: موجودہ زمانہ میں اگر آپ غور فرمائیں گے تو ہمارے معاشرہ میں خواہ وہ تعلیم یافتہ ہو یا غیر تعلیم یافتہ یہ رسم بد پڑ چکی ہے کہ لوگ اپنی ذاتی رائے کوئی نہیں رکھتے بلکہ خوشی یا ناخوشی سے اپنی پارٹی کے ساتھ رائے دینا ضروری سمجھتے ہیں اور اسی لئے حکومت میں پارٹیوں کا وجود کوئی فائدہ مند نہیں ہو سکتا۔ اسلام میں حریت رائے کے سامنے اپنی پارٹی کی رعایت کی کوئی حیثیت نہیں رکھی گئی بشرطیکہ وہ خلوص اور دیانت پر مبنی ہو اگر یہ اصول ملحوظ رکھا جاتا تو آپ خود ہی انصاف فرمالیں کہ مخالف پارٹی کی پھر ضرورت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے اور اگر وہی تحزّب اور پارٹی بندی کی روح کارفرما ہے تو پھر مخالف پارٹی کا فائدہ کیا نکل سکتا ہے، کاش کہ اگر ہمارا اختلاف پارٹی بندی سے بلند ہو کر محض آزادانہ ہو تو اگر مسلمانوں کی مشترکہ جماعت کا فیصلہ ہماری رائے کے خلاف بھی ہو جائے تو ہمارے خلوص کا تقاضا یہی ہونا چاہیئے کہ ہم کو اس میں ناگواری محسوس نہ ہو۔

اوس ابن شرجبیلؓ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے خود سنا ہے کہ اگر

کوئی شخص جان بوجھ کر کسی ظالم کے ساتھ اس نیت سے چلا کہ ظلم میں اسکی مدد کرے تو وہ شخص اسلام کی سرحد سے باہر نکل گیا" رواہ البیہقی فی شعب الایمان" اس حدیث سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اسلام میں صرف اپنی پارٹی کی رعایت سے رائے دینا اور اس پر غور نہ کرنا کہ حق کس طرف ہے اور ناحق کس طرف، یہ کتنی سخت بات ہے۔

حکومتِ اسلامیہ میں تفرقہ اندازی ناقابل عفو جرم ھے

(۲۵) عَنْ عَرْفَجَةَ رض قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّهٗ سَيَكُوْنُ هَنَاتٌ وَّهَنَاتٌ فَمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّفَرِّقَ اَمْرَ هٰذِهِ الْاُمَّةِ وَهِيَ جَمِيْعٌ فَاضْرِبُوْهُ بِالسَّيْفِ كَائِنًا مَّنْ كَانَ۔
رواہ مسلم مشکوٰۃ صفحہ ۳۲۰

ترجمہ: عرفجہ رض سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے خود سنا ہے کہ آپ نے فرمایا آئندہ زمانہ میں قسم قسم کے فسادات ہونگے، اگر کوئی شخص ایسی حالت میں جبکہ لوگ کسی ایک حاکم کو تسلیم کر چکے ہیں ان میں پھوٹ ڈالنے کا ارادہ کرے تو اسکو قتل کر دینا چاہیے خواہ وہ کوئی بھی شخص ہو۔

شرح: یہاں یہ حقیقت پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اسلامی قانون

کے مطابق جب اہل حل و عقد کسی شخص کو اپنا امیر و خلیفہ
اور آجکل کی اصطلاح میں اپنا حاکم مقرر کرلیں تو اب آخری
حد تک اسکی اطاعت کرنیکی تاکید کی گئی ہے اور ذرا ذرا
سے اختلافات پر حکومت کی تبدیلی کو اسلامی سیاست کے
لئے انتہائی ضعف کا باعث سمجھا گیا ہے اسلئے جہاں آئے دن
انقلابات برپا ہوتے رہتے ہیں وہاں نہ خود حاکم مطمئن رہتا
ہے نہ رعایا اور نہ ملک ہی کو اطمینان کی زندگی نصیب ہوتی ہے،
کسی حکومت کی مضبوطی کیلئے عوام کا اعتماد اور ملک کی یکجہتی
لازمی چیز ہے اسلئے شریعت نے یہ اصول بنا دیا ہے کہ جب کوئی
سردار مقرر ہو جائے تو جماعت کو چاہئے کہ دل سے اسکی اطاعت
کرے، اگر ایسا نہیں ہوگا تو وہ کبھی زندگی کی کشمکش سے رہا
نہیں ہوسکے گی، کسی انسان کا قتل کرنا کوئی اچھی بات نہیں،
بُری بات ہے لیکن اگر اسکے وجود سے جماعتی فساد پیدا ہوتا ہے
تو وہ اس سے بڑھکر بُرا ہے، اسلئے جب اس فساد کا ازالہ
کسی اور طرح ممکن نہ ہو تو پھر خود اس مفسد ہی کو نیست و نابود
کر دینا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

اگر مذکورۂ بالا حقیقت پیشِ نظر رہے اور خوفِ خدا اور

دیانت دل میں موجود ہو تو انقلابات کا خود بخود سدِّ باب ہو سکتا ہے، جہاں تک تجربہ شاہد ہے یہی ثابت ہوتا ہے کہ انقلابات بیشتر اقتدار کی ہوس میں رُونما ہوتے ہیں اور اسی لئے وہ نہ قوم کے حق میں کامیاب ثابت ہوتے ہیں اور نہ ملک کے لئے مُثمر، بلکہ بعض اشخاص اپنے معاشرہ کا جائزہ لئے بغیر موجودہ اقتدار پر مفسد ہونیکا حیلہ بناکر فساد کا جھنڈا ہاتھ میں اٹھا لینا اپنے لئے باعثِ کامیابی سمجھ لیتے ہیں اور اسپر غور نہیں کرتے کہ اس زمانہ کے لحاظ سے وہ کوئی دوسری قابلِ قدر شخصیت جو اسلامی معیار پر پوری اُتر سکتی ہو برسرِ اقتدار لاسکتے ہیں کہ نہیں، یہ فیصلہ اپنی ذاتی رائے سے نہیں کیا جاسکتا بلکہ جس طرح اسلامی اقتدار اہلِ حل و عقد کی رائے سے حاصل ہوتا ہے اسی طرح اسکا عزل بھی انہیں کی رائے کے تابع ہوتا ہے. اسلامی نقطۂ نظر سے جو لوگ علم و فہم نہیں رکھتے وہ صحیح رائے بھی نہیں رکھتے اسلئے یہاں انکی رائے کوئی رائے نہیں کہی جاسکتی.

جن ممالک میں فیصلہ اکثریت کی رائے سے ہوتا ہے انمیں علم و فہم کا دائرہ بہت وسیع ہے لیکن ہم نے اپنی نافہمی سے اسطرف تو نظر نہیں کی اور بے سوچے سمجھے انکی نقّالی شروع کردی.

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ اور اسی قسم کی بہت سی چیزوں میں ہم خود اپنی نافہمیوں کی بدولت دن بدن خود اپنی قوم اور غیروں کی نظروں میں بھی گرتے چلے جاتے ہیں۔

وہ آخری حد جسکے بعد کسی اسلامی اور صالح معاشرہ کیلئے غیر صالح حاکم کے ساتھ مقابلہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے

(۳۶) عَنْ اُمِّ سَلَمَۃَ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَکُوْنُ عَلَیْکُمْ اُمَرَآءُ تَعْرِفُوْنَ وَتُنْکِرُوْنَ فَمَنْ اَنْکَرَ فَقَدْ بَرِیَٔ وَمَنْ کَرِہَ فَقَدْ سَلِمَ وَلٰکِنْ مَّنْ رَّضِیَ وَتَابَعَ قَالُوْا اَفَلَا نُقَاتِلُھُمْ قَالَ لَا مَا صَلَّوْا اِلَا مَا صَلَّوْا۔ اَیْ مَنْ کَرِہَ بِقَلْبِہٖ وَاَنْکَرَ بِقَلْبِہٖ

رواہ مسلم۔ مشکوٰۃ صفہ ۳۱۹

ترجمہ: حضرت ام سلمہ رضؓ روایت فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آئندہ تم پر ایسے حاکم مقرر ہونگے کہ انمیں بھلی باتوں کے ساتھ بری باتیں بھی ہوں گی، اب جس شخص نے انکی بری باتوں پر اپنی بیزاری کا اظہار کر دیا وہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گیا اور جو دل ہی دل میں کڑھتا رہا وہ بھی بچا رہا، لیکن جو انکی بری باتوں پر خوش ہوا اور ان کے ساتھ ساتھ رہا (وہ ہلاک ہوا) اس پر انہوں نے عرض کی کہ کیا ایسے حاکموں

کے ساتھ ہم مقابلہ کیلئے کھڑے نہ ہو جائیں، آپ نے فرمایا ہر گز نہیں جب تک کہ وہ لوگ نمازیں پڑھتے رہیں۔

شرح: یہ معلوم رہنا چاہئے کہ اسلام کی اطاعت شعاری کیلئے بہت زیادہ تاکید فرمائی ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں آراء کا اختلاف کبھی ختم نہیں ہو سکتا، ہر قابل سے قابل اور صالح سے صالح شخصیت کے ساتھ دوسرے شخص کو اختلاف ہو سکتا ہے بلکہ پہلے بھی ہوتا رہا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہیگا، لہٰذا اگر یہاں ہر اہل و نااہل کو ہر بات پر نکتہ چینی اور اختلاف کرنیکی آزادانہ اجازت دیدی جائے تو نظامِ حکومت قائم رکھنے کا کوئی راستہ ہی نکل نہیں سکتا، اسلئے ضروری تھا کہ اسکے لئے کوئی نہ کوئی حد خود صاحب شریعت کی جانب سے مقرر کر دیجائے، لیکن اس سے قبل یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ یہ خطاب کس ماحول میں تھا اور کن کو تھا؟

یہاں متکلم بہ نفسِ نفیس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور آپ کے مخاطب تمام روئے زمین کے چیدہ اور سب سے پاکیزہ نفوسِ قدسیہ ہیں یعنی صحابۂ کرام، اس وقت کے معاشرہ کی بلندی کا حال پوچھنا کیا ہے ہر ہر متنفس خدا ترس، بنی نوع انسان

کا ہمدرد اور مجسم ایثار ہے، معصیت، خود غرضی اور انسانوں کے ساتھ بدسلوکی اگر کہیں نظر آئے بھی تو اسکے ساتھ اس سے زیادہ توبہ واستغفار، تضرع وابتہال کا شور مچا ہوا ہے، نافہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ وہ دور تھا جسمیں مسلمانوں کا کام صرف مسجدوں میں پڑے رہنا تھا اور ان ظالموں کو اتنا بھی نظر نہیں آتا کہ یہ زمانہ وہ زمانہ تھا جبکہ اسلام کی بنیاد رکھی جا رہی تھی اور اینٹوں کی بجائے اسمیں مسلمانوں کے سر اور پانی گارے کے بجائے مسلمانوں کے خاک وخون بنیادوں میں رکھے جا رہے تھے، وہ نمازی ضرور تھے مگر ایسے نمازی تھے کہ اگر عین جنگ کی حالت میں بھی نماز کا وقت آجاتا تو اپنے رب کے سامنے وہیں صف آرا ہو جاتے اور ٹھیک اسی وقت دشمنوں کے مقابلہ کیلئے بھی سرگرم رہا کرتے، حاکم و محکوم، مولا و غلام، امیر وغریب میں کسی جگہ کوئی فرق نظر نہ آتا تھا۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

اب آپ سوچیں کہ ایسے صالح معاشرہ کا حاکم کتنا بڑا صالح شخص ہونا چاہیئے، اور اگر بدقسمتی سے کوئی غیر صالح حاکم مسلّط ہو جائے تو اسکے متعلق صلاحیت کی شرائط میں کہاں تک نرمی

کیجا سکتی ہے، یہ ظاہر ہے کہ دین سب کا سب ہی بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے لیکن نماز کو دینی ارکان میں جو حیثیت حاصل ہے اسکو ایسا سمجھئے جیسا کہ اس بانس کو جو درمیانِ خیمہ میں لگا ہوا ہوتا ہے کہ اسکو اگر گرا دیا جائے تو سارا خیمہ نیچے آپڑتا ہے، گویا کہ خیمہ کی نہ صورت قائم رہتی ہے اور نہ اسکے تاننے کا جو مقصد تھا وہ باقی رہتا ہے، لہٰذا اگر کسی صالح معاشرہ کا حاکم بد دینی میں اس نوبت کو پہنچ جائے کہ اسکو اقامتِ صلوٰۃ جیسے فریضہ کی بھی پرواہ باقی نہ رہے تو کیا وہ ایسے صالح معاشرہ کے لئے قابلِ برداشت ہوسکتا ہے، قرآنِ کریم نے جو تمکین فی الارض اور حکومتِ اسلامی کے اہم فرائض بیان کئے ہیں وہ ان الفاظ میں ذکر فرمائے ہیں :- اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ (وہ لوگ کہ اگر ہم انکو قدرت دیں ملک میں تو وہ قائم رکھیں نماز اور دیں زکوٰۃ اور حکم کریں بھلے کام کا اور منع کریں برائی سے اور اللہ کے اختیار میں ہے آخر ہر کام کا) (پارہ ۱۷، رکوع ۱۳)

آیت بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر مسلمانوں کو زمین کے

کسی ٹکڑے پر اطمینان اور شوکت کے ساتھ بیٹھنا نصیب ہو جائے
تو انکے فرائض میں سب سے پہلے یہ ہے کہ وہ اس زمین میں صرف
اتنا ہی نہیں کہ خود نمازیں پڑھیں بلکہ صحیح طریقہ پر نمازوں کے
پڑھنے کا عام دستور طاقت کے ساتھ قائم کر دیں اور مالیات
کے سلسلہ میں زکوٰۃ کی ادائیگی کا پورا اہتمام اور معاشرہ کی پوری
پوری اصلاح کرنے کیلئے عمدہ عمدہ باتوں کے احکام نافذ کریں
اور تمام فواحش و منکرات کی جڑ اکھاڑ کر پھینکدیں۔ لیکن اگر
خدانخواستہ معاشرہ بگڑتے بگڑتے اس نوبت کو جا پہنچے کہ جو شخص
نمازی ہو الٹا اسکی طرف انگلیاں اٹھنے لگیں اور اس پر آوازے
کسے جانے لگیں تو کیا اب بھی حاکم کی اطاعت سے دست کشی
کے لئے یہی حد مقرر کیجا سکتی ہے، ظاہر ہے کہ اگر ان حالات میں
اسی حقیقی حد کو باقی رکھا جائے تو بہت ممکن ہے کہ ہماری بدقسمتی
سے ایک بے نمازی حاکم کے بجائے دوسرا اس سے بدتر بے نمازی
حاکم بیٹھا ہوا نظر آئے اسلئے حدیثوں کو سمجھنے کیلئے صرف لفظوں کا
رٹنا کافی نہیں بلکہ بہت سے امور اور مصالح کا سامنے رکھنا بھی
ضروری ہوگا، ان حالات میں یہ سوال باقی رہتا ہے تو اچھا پھر
وہ حد کیا ہے کہ جسکے بعد مسلمانوں کے حاکم کا قابل عزل ہونا ضروری

قرار پائے تو اسکے جواب کیلئے اس وقت کے معاشرہ کا جائزہ لینا ضروری ہوگا، اسلئے کوئی ایک جواب نہیں دیا جاسکتا، بلکہ یہ معاشرہ کے اختلاف سے مختلف ہوتا رہیگا اگرچہ آخری جواب وہی ہوگا جو حدیث میں مذکور ہے۔

مشکوٰۃ شریف صفحہ ۳۱۹ پر ایک حدیث ہے جس سے مذکورۃ بالا مضمون کی اور زیادہ وضاحت ہو جاتی ہے اور اس آخری حد کے متعین کرنے میں بڑی حد تک مدد ملتی ہے۔ عبادہ بن صامت رضؓ سے روایت ہے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات پر بیعت کی کہ ہم آپ کا ہر فرمان سنیں گے اور مانیں گے، فراخی میں بھی اور تنگدستی میں بھی، خوشی میں بھی اور ناخوشی میں بھی، غرض کہ ہر حالت میں اور اس بات پر بھی کہ اگرچہ ہماری حق تلفی کیجائے اور دوسروں کو ہمارے اوپر ترجیح دیجائے اور اس پر کہ ہم سچی بات کا اعلان کرتے رہینگے جہاں بھی ہوں اور کسی ملامت کرنے والے کی ہرگز پروا نہیں کریں گے۔ اور ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ہم میں جو شخص حکومت کا اس وقت اہل ہوگا اسکے ساتھ کبھی جھگڑا نہیں ڈالیں گے ہاں صرف اس صورت میں جبکہ

کھلّم کھلّا کفر نظر آنے لگے اور وہ بھی ایسا کہ جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے پاس کھلا ہوا ثبوت موجود ہو۔ (بخاری و مسلم)

اس حدیث سے اس بات کی اہمیت دریافت کیجا سکتی ہے کہ اگر کسی زمانہ میں مسلمانوں کا حاکم بدقسمتی سے ایسا شخص منتخب ہو جائے جسکے دل میں شریعت کا لحاظ و پاس باقی نہ رہے تو اسلام اندرونی خلفشار کی بجائے اس ناقابلِ برداشت فساد کو کہاں تک برداشت کرنیکی ہدایت کرتا ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ جب معاملہ اسلام کی سرحد سے نکلکر کفر کی سرحد میں داخل ہو جائے تو اب اس کا نام ہی اسلامی حکومت باقی نہیں رہ سکتا، اسلئے مسلمانوں کو نقصان ہو یا نفع ان کی سیاست بنے یا بگڑے اسکے برداشت کرنیکا حکم کیسے دیا جا سکتا ہے۔

ترجمان السنّہ جلد ۳ صفحہ ۱۱۳ تا ۱۲۸ پر اسکی تفصیل ملاحظہ کی جائے۔

حاکم جبتک حاکم رہے وہ آخری لمحہ حکومت تک عوام کی نظروں میں محترم رہنا چاہیئے

(۲۷) عَنْ زِیَادِ بْنِ کُسَیْبِ نِ الْعَدَوِیِّ رضؓ قَالَ کُنْتُ مَعَ اَبِیْ بَکْرَۃَ رضؓ

تَحْتَ مِنْبَرِ ابْنِ عَامِرٍ وَهُوَ يَخْطُبُ وَعَلَيْهِ ثِيَابٌ رِقَاقٌ فَقَالَ اَبُوْبِلَالٍ اُنْظُرُوْا اِلَى اَمِيْرِنَا يَلْبَسُ ثِيَابَ الْفُسَّاقِ فَقَالَ اَبُوْبَكْرَةَ اُسْكُتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ مَنْ اَهَانَ سُلْطَانَ اللّٰهِ فِي الْاَرْضِ اَهَانَهُ اللّٰهُ۔

رواہ الترمذی وقال ھذا حدیث حسن غریب مشکوٰۃ صفحہ ۳۲۱

ترجمہ: زیاد بن کسیب عدویؒ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ میں ابوبکرہ کے ساتھ ابن عامر کے منبر کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور وہ اس وقت باریک کپڑے پہنے ہوئے خطبہ دے رہا تھا تو اسکو دیکھکر ابوبلال نے کہا کہ ذرا ہمارے امیر کو دیکھو تو کیسا لباس پہنے ہوئے ہے، جیسا فاسق لوگوں کا ہوتا ہے، اس پر ابوبکرہ نے فوراً ٹوکا اور فرمایا خاموش رہ، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے یہ خود سنا ہے کہ جس نے خدا کے مقرر کردہ حاکم کی بے عزتی کی اللہ تعالیٰ اس کی بے عزتی کرے گا۔

شرح: شرعی نظر میں حاکم اور محکوم اپنے اپنے رتبہ میں سب محترم ہیں اور ہمارے موجودہ زمانہ کی ذہنیت کی طرح ایک ادنیٰ شخص کو بھی ذلت کی نظر سے دیکھنا کسی حاکم کے لئے روا نہیں رکھا گیا، یہ بات دوسری ہے کہ جرم کی نوعیت کے لحاظ

سے جس سلوک کا وہ مستحق ہے وہ اسکے ساتھ کرنا ضروری ہے
لیکن صرف حکومت کے نقطۂ نظر سے اسکو ذلیل سمجھنا یہ بدترین
ذہنیت ہے، جو شریعت محکوم کے متعلق یہ ذہنیت پیدا کرنا
چاہتی ہو اب تم خود سوچ لو کہ وہ حاکم کے متعلق کتنی بلند ذہنیت
پیدا کرنا چاہتی ہوگی، حاکم و محکوم کے اس خاص علاقہ چھوڑ کر
شرعی معاشرت کا ایک عام قانون یہ ہو کہ جو چھوٹا شخص اپنے
سے عمر میں بڑے شخص کی تعظیم نہ کرے اور جو بڑی عمر کا آدمی اپنے
چھوٹے پر شفقت نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں، جہاں عام معاشرہ
کے لئے یہ ضروری ہو وہاں حاکم و محکوم کے مابین نظام قائم
رکھنے کیلئے جتنی عاقبت اندیشی اور احتیاط کے ساتھ اسکے احترام
کو لازم قرار دیا ہوگا وہ ظاہر ہے، اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں
کہ حاکم جتنا چاہے مطلق العنان ہوکر اپنی رعایا کے سامنے
انگشت نمائی کے سامان پیدا کرتا رہے، لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ
ہر دور میں ہر حاکم منصب حکومت پر بیٹھ کر صحیح توازن
قائم رکھنے کی اہلیت نہیں رکھ سکتا جب تک اسکے قلب پر
خدا تعالیٰ کے خوف اور خشیت کا پورا استیلاء نہ ہو، اب اگر
ان حالات میں رعایا کو نکتہ چینی اور اعتراضات کی عام اجازت

دیدی جائے تو پھر ایسے حاکم کا رعب بھلا کیا قائم رہ سکتا ہے اور جب تک حاکم کا رعب نہ ہو اس وقت تک دنیوی نظام قائم نہیں رہ سکتا، اسلئے حدیث بالا میں ابوبکرہؓ صحابی نے اپنے حاکم کی توہین گوارہ نہیں کی اور اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ایسا حکیمانہ ارشاد سنایا جو اہل فہم کو رہتی دنیا تک یاد رکھنا چاہیئے، اور وہ یہ کہ حکومت اور سلطنت کا قرعہ جسکے نام نکلتا ہے وہ خدائی معیت کا عکس ہوتا ہے اب اگر وہ ظالم یا نا اہل ہے تو بھی کسی مصلحت سے قدرت نے اسکا انتخاب کیا ہے اور اگر صالح اور اہل ہے تو بھی باطنی نظر میں وہ اسکی پسندیدگی کا ثمرہ ہے لہٰذا بادشاہ کی توہین کرنا گویا خدائی انتخاب کی توہین ہے اور اسکا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو پہاڑ سے ٹکرائے گا خود پاش پاش ہو کر رہ جائے گا یہاں دو باتیں یاد رکھنا ضروری ہیں ایک یہ کہ سلطان اللہ کا مطلب یہ ہے کہ اس بادشاہ کا انتخاب اسلامی نظریات کے مطابق ہوا ہو خواہ معاشرہ کے فساد کی وجہ سے اس وقت کوئی مفسد شخص ہی برسر اقتدار کیوں نہ آجائے، دوسری بات یہ کہ بادشاہ کی توہین کرنا یہ بالکل دوسرا مسئلہ ہے اب رہا

آئین و ضوابط کے ماتحت بوقتِ ضرورت کسی غیر شرعی معاملہ کے متعلق سوال کرنا تو یہ اہلِ فہم اور سنجیدہ افراد کا حق ہے جو مطلقاً ان سے سلب نہیں کیا جا سکتا، توہین اور استہزاء ایجی ٹیشن AGITATION اور مقابلہ اور حکومت کے خلاف عوام کو بھڑکانا یہ بالکل جداگانہ باتیں ہیں، ان میں فرق کرنا چاہیے اور نافہمی سے دونوں کو یکساں نہیں سمجھنا چاہیے۔

جو قوم موت کا خوف اپنے دل میں رکھتی ہے وہ عزّت کی حیات اپنے ہاتھوں سے کھو بیٹھتی ہے

(۲۸) عَنْ ثَوْبَانَ رضؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُوْشِکُ الْاُمَمُ اَنْ تَدَاعٰی عَلَیْکُمْ کَمَا تَدَاعَی الْاٰکِلَۃُ اِلٰی قَصْعَتِھَا فَقَالَ قَائِلٌ وَّمِنْ قِلَّۃٍ نَّحْنُ یَوْمَئِذٍ قَالَ بَلْ اَنْتُمْ یَوْمَئِذٍ کَثِیْرٌ وَّلٰکِنَّکُمْ غُثَاءٌ کَغُثَاءِ السَّیْلِ وَ لَیَنْزِعَنَّ اللّٰہُ مِنْ صُدُوْرِ عَدُوِّکُمُ الْمَھَابَۃَ مِنْکُمْ وَ لَیَقْذِفَنَّ فِیْ قُلُوْبِکُمُ الْوَھْنَ، قَالَ قَائِلٌ یَّا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَمَا الْوَھْنُ قَالَ حُبُّ الدُّنْیَا وَکَرَاھِیَۃُ الْمَوْتِ۔

رواہ ابوداؤد والبیھقی فی دلائل النبوۃ۔ مشکوٰۃ صفحہ ۴۵۹

ترجمہ: ثوبانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ وقت قریب ہے کہ تمہاری مثال اس پیالہ کی سی ہوگی جس میں تیار شدہ کھانا موجود ہو اور لوگ اسکے اِردگرد بیٹھے ہوئے ایک دوسرے کو یہ کہکر دعوت دیں کہ آؤ بھئی اسکو کھالو، اس پر ایک شخص نے تعجب سے کہا کیا لوگوں کو یہ جرأت اسلئے ہوگی کہ ہماری مردم شماری اس زمانہ میں بہت کم ہوجائیگی، آپنے فرمایا نہیں نہیں اس دن عدد کے لحاظ سے تم بہت ہوگے لیکن تمہاری مثال اُس خس خاشاک کی سی ہوجائیگی جو بارش کے بہتے ہوتے پانی کے اوپر تیرتا نظر آتا ہے اور اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے (تمہاری بدافعالی کی بدولت) تمہارا خوف اور رعب نکالدیگا اور تمہارے دل میں اَلْوَھْنُ کا روگ ڈالدیگا۔ ایک شخص نے پوچھا یارسول اللہ الوھن کیا چیز ہے، آپنے ارشاد فرمایا کہ دنیا کی محبت اور موت کا خوف۔

شرح: موجودہ دور میں مسلمان اپنے دشمنوں کے درمیان جسطرح گھرے ہوئے ہیں اور ہر طرف سے ان کو عالم سے نیست و نابود کرنے کی جس طرح دشمنوں کی نظریں بڑی لاپرواہی کیساتھ ہماری طرف لگ رہی ہیں انکا سب سے سچا فوٹو کیا ان الفاظ سے زیادہ بہتر طریقہ سے کھینچا جاسکتا ہے جو حدیث بالا میں

مذکور ہوئے، حیرت یہ ہے کہ ہماری پستی و نکبت کا یہ فوٹو ایسی
طاقت کے زمانہ میں کھینچا جا رہا تھا جبکہ اس بات کا سمجھنا
مخاطبین کو اتنا بعید معلوم ہوتا تھا کہ اسکا سبب پوچھے بغیر
آخر کار ایک شخص سے رہا نہ گیا، پھر جنکے سامنے اُمت کے
عروج و نزول کے تمام دَور وحی کے قطعی اور یقینی ذریعہ سے
سب کے سب کھولکر رکھدئے گئے تھے انہوں نے ہمارے اس
روگ کی کتنی صحیح تشخیص کی پھر کتنی مختصر کہ صرف دو لفظوں
میں اسکا لُب لُباب نکالکر رکھدیا، اگر آج ہم میں حدیث و
قرآن پر یقین کی حقیقی روح موجود ہوتی تو ہم اسلام کے ایک
اسی لفظ پر قربان ہوجاتے کیا یہ بات نہیں کہ ہماری تعداد
بحمد اللہ تعالیٰ اس وقت دنیا میں بہت بڑی تعداد ہے لیکن
اسکے ساتھ اگر آپ ہمارے اسلام کو کسوٹی پر کس کر دیکھیں تو
آپ کو یہی ثابت ہوگا کہ ہمارا دعوائے اسلام گو بہت بلند آہنگی
کیساتھ ہورہا ہے لیکن اسمیں حقیقت اتنی بھی نہیں ہے جتنی حدیث
کے لفظوں میں خس و خاشاک کی ہوتی ہے، کیا آج ہمارے دلوں
میں بلکہ روئیں روئیں میں مال کی محبت گھسی ہوتی نہیں ہے؟
کیا ہم کبھی یہ احتیاط رکھتے ہیں کہ جس مال کی محبت میں فنا

ہو رہے ہیں وہ حلال راستہ سے آتا ہے یا حرام راستہ سے، ظلم و عدوان کی راہ سے حاصل ہو رہا ہے یا عدل و انصاف کی راہ سے یا آنکھ میچ کر صرف اسکو سمیٹنے میں مشغول ہیں خواہ اسمیں ہمیں اپنے ملک و قوم کو کھو دینا ہی کیوں نہ پڑے، پھر اسی کیساتھ اپنے دلوں کی طرف غور کر کے دیکھئے کہ انمیں موت سے خوف کتنا پیدا ہو گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مال و دولت کی محبت کیساتھ جاں فروشی کی روح کبھی پیدا نہیں ہو سکتی اسلئے اگرچہ یہاں موت کا خوف اور مال کی محبت یہ لفظ تو دو ہیں مگر انکی حقیقت ایک ہی ہے اور جب اسکا احساس دشمنوں کو ہو جاتا ہے کہ کسی قوم میں جاں فروشی کی بجائے عیش پرستی کی روح داخل ہو چکی ہے تو پھر فطرتاً اُنکے دلوں سے ایسی قوم کا رعب و خوف نکل جاتا ہے اور یہی دشمنوں کی دلیری کا باعث بن جاتا ہے۔

مشترکہ ہند میں گذشتہ دور میں مسلمانوں کے ساتھ کتنے ہی معرکے پیش آئے جن میں مسلمان نہتے تھے اور مال و دولت کی نعمت سے بھی محروم تھے لیکن جب جنگی سرگرمیوں نے ایک بار یہ ثابت کر دیا کہ مسلمانوں میں ابھی جاں فروشی کی روح باقی ہے تو انکے دلوں میں مسلمانوں کا رعب ایسا طاری ہوا کہ وہ بتیس ۳۲

دانتوں میں ایک زبان ہو کر سالہا سال آرام کی نیند سویا کئے کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ ہم اپنی کمزوریوں کا احساس کریں اور مرض وعلاج کی صحیح تشخیص وتجویز کے بعد بھی اسکے معالجہ کیطرف متوجہ نہ ہوں۔ فَاعْتَبِرُوْا یٰاُولِی الْاَبْصَارِ (سو عبرت پکڑو اے آنکھ والو) پارہ ۲۸ رکوع ۴

اس ضمن میں یہ تنبیہ کردینی بھی موزوں معلوم ہوتی ہے کہ آج سے تیرہ سو سال پہلے قرآن کریم نے جو حکم مسلمانوں کو دیا ہے وہ یہ ہے:۔ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ (اور تیاری کرو انکی لڑائی کیلئے جو کچھ جمع کرسکو قوت سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے کہ اُس سے دھاک پڑے اللہ کے دشمنوں پر اور تمہارے دشمنوں پر) (پارہ ۱۰ رکوع ۴)

یعنی کفار کیلئے جو قوت بھی تم تیار کرسکتے ہو اسکی تیاری میں لگے رہو ان میں سے اس وقت کے لحاظ سے ایک بات یہ ہے کہ جہاد کرنیکے لئے گھوڑے بھی پالو یہ سب تیاری اس مقصد کیلئے ہے کہ دشمنوں پر رعب جمے اور تمہاری دھاک ان پر بیٹھی رہے اس لحاظ سے ہر زمانہ میں جو آلاتِ جدیدہ ایجاد ہونگے ان کو بھی زیادہ سے زیادہ جمع کرنا اسی آیت کے حکم میں داخل ہے اسلامی نقطۂ نظر

سے اعلاء کلمۃ اللہ کا سب سے بڑا ذریعہ سپاہیانہ زندگی اور فوجی ٹریننگ
ہے اسلئے ہر ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ عیش پرستی کی زندگی چھوڑ
کر ایک فوجی جوانمرد بنے اور جتنا آج وہ مادی ترقیات کے پیچھے
پڑا ہوا نظر آتا ہے اتنا ہی فوجی ٹریننگ حاصل کرنیکا شوقین نظر
آئے کیونکہ جو شخص خود اپنے گھر کی حفاظت نہیں کرسکتا وہ دین و
ملک کی حفاظت کیا کریگا، دنیا میں ملٹری (MILITARY) اور
سویلین (CIVILIAN) کی تقسیم علیحدہ علیحدہ ہے، لیکن اسلام میں
ہر مسلمان جس طرح نماز اور روزہ کا مخاطب ہے اسی طرح وہ جہاد کا
بھی مخاطب ہے، لیکن آہ اسلام سے غفلت کی بدولت ہماری ترقی
کی راہیں اتنی مسدود ہیں کہ آج اگر ہماری پبلک سب کی سب
مسلح کر دیجائے جیسا کہ عہد سلف میں رہا کرتی تھی تو شاید سب سے
پہلے مسلمان کا ہتھیار مسلمان کے مقابلہ میں گھر گھر اس طرح استعمال
ہونے لگے کہ تعدد ازدواج اور برتھ کنٹرول (BIRTH CONTROL)
کے مسائل پر غور کرنیکی ضرورت ہی باقی نہ رہے یعنی مسلمانوں کی
کثرت خود اپنے ہاتھوں اتنی قلت میں تبدیل ہوجائے کہ پانی
اور غذا کی فراہمی کی جو مشکلات درپیش ہیں ہماری بدنصیبی سے
ان کی حاجت باقی نہ رہے، کتنا افسوس ہے کہ ایک زمانہ وہ تھا کہ

ہم میں کا ایک ایک مسلمان مُسلّح تھا، ہم میں کا ایک ایک فرد بہادری وطاقت میں رستم واسفندیار تھا، لیکن جب کبھی مسلمانوں کے درمیان اختلافات کی نوبت آتی تو ہم ہی سب سے زیادہ نہتے اور سب سے زیادہ بُزدل نظر آتے تھے، پھر جب عالم کے انقلابات نے نقشہ بدلا اور خونریزی کا بازار خود مسلمانوں کے درمیان گرم ہوگیا تو اسی دن سے ہمارا دور انحطاط شروع ہوگیا اور بدقسمتی سے وہ انحطاط صرف ملکی نہ تھا بلکہ اس سے زیادہ دینی تھا اور آج نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ہم جو کبھی مخلوقِ خدا کا بوجھ اٹھایا کرتے تھے خود اپنا بوجھ بھی اٹھانے کے قابل نہ رہے اور اپنے دشمنوں سے بھیک مانگ مانگ کر بڑی ذلت کے ساتھ اپنی زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں، وقت اب بھی نہیں گیا ہے اگر ہم آج بھی مِلکر قرآن کریم کی آیتوں پر صحیح صحیح عمل کرنا شروع کردیں تو ہمارے دن پھر جائیں اور ہم اسی عزت کی حیات کے مالک نظر آسکتے ہیں۔

جنگ اسلئے کیجاتی ہے کہ فتنہ فرو ہو، اسلئے نہیں کیجاتی کہ فتنہ اور بپا ہو

(۲۹) عَنْ نَافِعٍ اَنَّ ابْنَ عُمَرَ رض اَتَاهُ رَجُلَانِ فِي فِتْنَةِ

ابْنِ الزُّبَیْرِ فَقَالَا اِنَّ النَّاسَ صَنَعُوْا مَا تَرٰی وَاَنْتَ ابْنُ عُمَرَ وَصَاحِبُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَمَا یَمْنَعُکَ اَنْ تَخْرُجَ فَقَالَ یَمْنَعُنِیْ اَنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ عَلَیَّ دَمَ اَخِی الْمُسْلِمِ قَالَا اَلَمْ یَقُلِ اللّٰہُ تَعَالٰی وَقَاتِلُوْھُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ فَقَالَ ابْنُ عُمَرَ قَدْ قَاتَلْنَا حَتّٰی لَمْ تَکُنْ فِتْنَۃٌ وَّکَانَ الدِّیْنُ لِلّٰہِ وَاَنْتُمْ تُرِیْدُوْنَ اَنْ تُقَاتِلُوْا حَتّٰی تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ لِغَیْرِ اللّٰہِ رواہ البخاری مشکوٰۃ صفہ ۵۵۲

ترجمہ: نافعؒ روایت کرتے ہیں کہ عبداللہ بن زبیر اور حجاج ظالم کی جنگ میں دو شخص ابن عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ لوگ کس خطرناک حالت سے گذر رہے ہیں اور آپ کس کے فرزند ہیں یعنی عمرؓ کے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی پھر آپ بھی جنگ کیلئے باہر کیوں نہیں نکل آتے اور کیوں اندر دبے بیٹھے بیٹھے دیکھ رہے ہیں انہوں نے فرمایا جو بات اسوقت مجھ کو جنگ سے مانع ہو رہی ہے وہ صرف ایک بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم سب پر مسلمانوں کا خون بہانا حرام فرمایا ہے اس پر اسنے کہا کیا قرآن میں ہی یہ ارشاد موجود نہیں کہ اُنسے اسوقت تک جنگ جاری رکھو جبتک فتنہ بالکل ختم نہ ہو جائے یہ سنکر ابن عمرؓ نے فرمایا جی ہاں ہمنے جنگ کی اور اسوقت تک کی کہ فتنہ نیست و نابود ہو گیا اور صرف ایک خدا تعالیٰ کا

دین غالب آگیا اب جنگ کر کر کے تم یہ ارادہ کر رہے ہو کہ پھر فتنہ اُٹھ کھڑا ہو اور اللہ تعالیٰ کے دین کی بجائے کفر کو غالب آنیکا موقع ملجائے

شرح: حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی مراد سمجھنے کیلئے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس گفتگو کے دوران میں جس آیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اسکی کچھ تشریح سُن لی جائے، قرآن کریم میں ارشاد ہے:

وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ

(پارہ ۹ سورۃ انفال ۔ رکوع ۵) یعنی کافروں سے جنگ جاری رکھو یہانتک کہ ان کا زور ٹوٹ جائے (یعنی کافر ایمان لانے سے نہ روک سکیں یا مذہب حق کو موت کی دھمکی نہ دے سکیں) اور اللہ کا دین سب پر غالب آجائے۔

آیتِ بالا میں جہاد کا ایک عظیم مقصد بیان کیا گیا ہے اور اسکے دو حصہ ہیں سب سے اہم مقصد خدا کے دشمنوں کی طاقت اور شوکت کو اتنا توڑ دینا ہے کہ پھر ان میں اسلام کے مقابل آکر جنگ کرنیکا حوصلہ باقی نہ رہے، اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ خدائی قانون عالم پر اسطرح پھیل جائے کہ غالب پھر وہی ہو اور بقیہ قوانین اسکے زیر قیادت وسیادت اپنے اپنے دائرہ میں محدود رہیں، کیونکہ تاریخ شاہد ہے جب کبھی کفار کو غلبہ ہوا مسلمانوں کا مذہب اور ایمان خطرہ میں پڑ گیا، اسپین کی

مثال دنیا کے سامنے ہے کس طرح قوت اور موقعہ ہاتھ آنے پر مسلمانوں کو تباہ کیا گیا یا مُرتد بنایا گیا، اور موجودہ زمانہ میں بھی اسکے شواہد دنیا کے سامنے ہیں حتیٰ کہ بعض ممالک میں مسلمانوں پر مظالم توڑنا گویا اپنی سیر و تفریح کا سامان سمجھا جاتا ہے جب چاہا پرندوں کی طرح ان کا شکار کھیل لیا، انکے جان و مال لُوٹ لئے، ان کی آبرو عزت برباد کر دی پھر کوئی نہیں ہوتا جو ان کی داد فریاد سنے۔

اسکے بعد ابن عمرؓ کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ جب تک ہمارے مقابل کفار تھے اسوقت تک ہم شیر نیستاں بنے رہے ہمارے سر ہتھیلیوں پر رکھے ہوئے تھے اور خدا کے دین کے غلبہ کیلئے ہم اپنے خون کی قیمت پانی کے قطرہ سے بھی کم سمجھتے رہے یہانتک کہ کفر کا سر نیچا ہو گیا اور اسکی طاقت و شوکت پاش پاش ہو کر نہ ہونیکے برابر ہو گئی، یہ تو وہ جنگ تھی جس کا قرآن نے ہم کو حکم دیا تھا اور الحمد للہ اسکا مقصد ہماری آنکھوں نے پورا ہوتے ہوئے دیکھ بھی لیا لیکن موجودہ جنگ جو عبداللہ بن زبیرؓ کے ساتھ ہو رہی ہے یہ مسلمانوں کے درمیان جنگ ہے، اس جنگ میں وہی بہادر نفوس سب سے زیادہ بُزدل نظر آنے چاہییں اور

مسلمانوں کے پسینہ کی قیمت وہ نظر آنی چاہیئے جو کبھی خون کی قیمت سمجھی جاتی تھی، پہلی جنگ کا نتیجہ یہ نکلا کہ تمام کرۂ ارض پر خدا کا دین غالب آگیا اور موجودہ مسلمانوں کی باہمی جنگ کا نتیجہ یہ ہو کر رہیگا کہ مسلمان روز بروز کمزور پڑتے چلے جائینگے اور خدائے تعالیٰ کے دین کے بجائے کفر کا غلبہ ہو جائے گا۔

ابن عمرؓ کے اِن مختصر جملوں سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اسلامی جنگ کے مقاصد کیا ہیں اور اس سے بڑھ کر یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کی باہمی خانہ جنگیوں کا نتیجہ کیا نکلکر رہتا ہے اسلئے حضرت ابن عمرؓ کے بیان کی روشنی میں مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ باہمی شدید سے شدید اختلافات کے باوجود اس نکتہ کا خیال رکھیں کہ انکے اندرونی اختلافات سے کہیں کوئی دشمن فائدہ اٹھانے نہ پائے، لیکن مسلمانوں کی ذہنیت بدل جانے کا نوحہ آج کس کے سامنے کیا جائے کہ وہ محض ضد میں آکر بڑی خوشی کے ساتھ یہ پسند کرنے لگے ہیں کہ جس صورت سے بھی ممکن ہو بات ان کی اونچی رہے خواہ دینِ خدا باقی رہے یا نہ رہے، یا خود ان کا ملک ان کے ہاتھوں سے نکلکر دوسروں کے قبضہ میں جا پہنچے۔

میں اسکے شواہد موجودہ دور میں بھی پیش کر سکتا ہوں کہ تاکہ واضح طور پر یہ نظر آجائے کہ آج مسلمان کس طرح ملک فروشی اور دین فروشی میں منہمک نظر آتے ہیں لیکن خلافِ مصلحت ہونے کی وجہ سے عنانِ قلم کو روکنا پڑتا ہے.

اہلِ فہم کے لئے دنیا کی موجودہ تاریخ سامنے ہے اور اشارہ کر دینا کافی ہے، مثل مشہور ہے:-

"اگر در خانہ کس است حرفے بس است"

یہاں اسلامی جنگ کے مقاصد اور معترضین کے اعتراضات کا جواب دینا مدِ نظر نہیں، یہ ایک جداگانہ موضوع ہے اور مستقل فرصت کا محتاج ہے، صرف یہ تنبیہ کرنی منظور ہے کہ کسی طرح مسلمان باہمی اختلافات سے اگر باز نہ آئیں تو کم از کم اپنے خیالات کو اتنی ہوا بھی نہ دیں کہ وہ بھڑک کر خود ان کو اور دین و ملک کو جلا کر خاکستر بنا دے۔

جنگ تمنا ئیں کرنیکی چیز نہیں ہے اور جب ناگزیر ہو جائے تو پھر ثابت قدم رہ کر اس کا مقابلہ کرنا چاہیے

(۳۰) عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ ابْنِ اَبِیْ اَوْفٰی رضؓ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي بَعْضِ اَيَّامِهِ الَّتِي لَقِيَ فِيهَا الْعَدُوَّ وَانْتَظَرَ حَتّٰى مَالَتِ الشَّمْسُ ثُمَّ قَامَ فِي النَّاسِ فَقَالَ يَا اَيُّهَا النَّاسُ لَا تَتَمَنَّوْا لِقَاءَ الْعَدُوِّ وَاسْأَلُوا اللّٰهَ الْعَافِيَةَ فَاِذَا لَقِيتُمُوْهُمْ فَاصْبِرُوْا وَاعْلَمُوْا اَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوْفِ ثُمَّ قَالَ اَللّٰهُمَّ مُنْزِلَ الْكِتٰبِ وَمُجْرِيَ السَّحَابِ وَهَازِمَ الْاَحْزَابِ اهْزِمْهُمْ وَانْصُرْنَا عَلَيْهِمْ ۔ متفق علیہ مشکوٰۃ صفحہ ۳۳۱

ترجمہ: عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی غزوہ میں جسمیں دشمن کے ساتھ آپکا مقابلہ ہوا اتنی دیر انتظار کیا کہ آفتاب ڈھل جائے اسکے بعد صحابہؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا دیکھو دشمن سے جنگ کی تمنائیں مت کرنا اور اللہ سے ہمیشہ عافیت مانگنا، جب جنگ سر ہی پڑ جائے تو پھر ثابت قدم رہنا اور اسکا یقین رکھنا کہ جنت کہیں دور نہیں بس تلواروں کے سائے کے نیچے ہے اسکے بعد یہ کلمات دعائیہ فرماتے اے خدا، اپنی کتاب کے نازل فرمانے والے اور بادلوں کے چلانیوالے اور دشمن کو شکست دینے والے ہمارے دشمن کو شکست دے اور انکے مقابلہ میں ہمکو فتح نصیب فرما۔

شرح: انسانی فطرت بالخصوص عوام کی کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ ذرا سی بات پر عواقب سے غافل ہو کر جذبات سے

بھڑک اٹھتی ہے اور سنجیدگی کے ساتھ ان پر نہ خود غور کرتی
ہے اور نہ دوسروں کو غور کرنیکا موقع دیتی ہے، یہاں صحیح
طریق تو یہ تھا کہ اس کج روی کے بجائے معاملہ انکے سپرد کر دیا
جاتا جو اسکے سمجھنے اور اسکے فیصلہ کرنیکے اہل تھے، لیکن ہماری
موجودہ جمہوریت کا مطلب یہ لیا گیا ہے کہ اسکے جمہور یعنی
ناعاقبت اندیش عوام اپنی طاقت سے اہل فہم کو اس پر مجبور
کر دیں کہ وہ انکی رائے کے سامنے جھک جائیں اگر جمہوریت کا
مفہوم یہی ہے تو اس سے بدتر شاید ہی کوئی اور چیز ہو گی۔
قرآن کریم میں ارشاد ہے: وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ
اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ ؕ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِي
الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ؕ وَلَوْلَا
فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطٰنَ اِلَّا قَلِيْلًا ؕ
(اور جب انکے پاس پہنچتی ہے کوئی خبر امن کی یا ڈر کی تو اسکو مشہور
کر دیتے ہیں اور اگر اس کو پہنچا دیتے رسول تک اور اپنے حاکموں تک
تو تحقیق کرتے اسکو جو ان میں تحقیق کرنیوالے ہیں اسکی اور اگر نہ ہوتا
فضل اللہ کا تم پر اور اسکی مہربانی تو البتہ تم پیچھے ہو لیتے شیطان کے
مگر تھوڑے) (پارہ ۵ رکوع ۸)

خلاصہ یہ کہ منافق اور کم سمجھ لوگوں کی ایک خرابی یہ ہے کہ جب کوئی بات امن کی پیش آتی ہے مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی سے صلح کا قصد فرمانا یا لشکرِ اسلام کی فتح کی خبر سننا یا اسکے برخلاف کوئی خوفناک خبر سن لینا جیسے دشمنوں کا کہیں جمع ہونا یا مسلمانوں کی شکست کی خبر آنا تو انکو بلا تحقیق کئے مشہور کرنے لگتے ہیں، اور اسمیں اکثر فساد اور نقصان مسلمانوں کو پیش آجاتا ہے، منافق ضرر رسانی کی غرض سے اور کم سمجھ مسلمان کم فہمی کی وجہ سے ایسا کرتے تھے، لہٰذا کہیں سے کوئی خبر آئے تو چاہیئے اول اپنے حاکم تک پہنچائیں اور اسکے نائبوں تک، جب وہ اس خبر کو تحقیق اور تسلیم کر لیں تو انکے کہنے کے موافق اسکو کہیں نقل کریں اور اسپر عمل کریں، اور اللہ اپنے فضل سے تمہاری اصلاح اور تربیت کیلئے احکام نہ بھیجتا اور تم کو وقتاً فوقتاً حسب ضرورت ہدایت اور تنبیہ نہ فرماتا رہتا جیسا کہ اس موقع پر رسول اور حاکموں کی طرف رجوع کرنیکو فرمایا تو تم کبھی کے گمراہ ہو جاتے سوائے ان چند کاملُ العقل اور کامل الایمان افراد کے جنہوں نے ان تنبیہات کو اللہ تعالیٰ کا انعام سمجھا اور شکر کیا اور انکی فوری تعمیل کی، قرآن کریم نے ایک دوسرے موقعہ

پر قوم بنی اسرائیل کا تذکرہ کیا ہے جو ایک ظالم بادشاہ کے ظلم سے تنگ آکر اپنے نبی کے پاس گئی اور اسکے سامنے اپنے مسائل رکھے اور اسپر یہ زور ڈالا کہ موجودہ مصائب کے ہوتے ہوئے ہمارے لئے جنگ ناگزیر ہوگئی ہے اور اب اللہ کے راستہ میں نکل کھڑے ہونیکے سوا ہمارے لئے کوئی اور راہ باقی نہیں رہی ہے لہذا آپ ہمارے لئے فوری طور پر کوئی جنگی پروگرام مرتب کر دیجئے چنانچہ ارشاد ہے: اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا قَالُوْا وَمَا لَنَا اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝

(جب انہوں نے کہا اپنے نبی سے مقرر کر دو ہمارے لئے ایک بادشاہ تاکہ ہم لڑیں اللہ کی راہ میں، پیغمبر نے کہا کیا تم سے یہ بھی توقع ہے کہ اگر حکم ہو تم کو لڑائی کا تو تم اسوقت نہ لڑو، وہ بولے ہم کو کیا ہوا کہ ہم نہ لڑیں اللہ کی راہ میں اور ہم تو نکال دئے گئے اپنے گھروں سے اور بیٹوں سے پھر جب حکم ہوا انکو لڑائی کا تو وہ سب پھر گئے مگر تھوڑے سے اُن میں کے اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے گنہگاروں کو) (پارہ ۲ رکوع ۱۶)

یہاں قوم بنی اسرائیل کا تذکرہ ہے کہ جب انکی نیت خراب ہوئی تب انپر ایک بادشاہ جالوت (نام ہے) مسلط ہوا، انکو شہر سے نکالدیا اور لوٹا اور انکو پکڑ کر غلام بنالیا، بنی اسرائیل بھاگ کر بیت المقدس میں جمع ہوئے اسوقت حضرت اشموئیل علیہ السلام پہنچے تو انسے درخواست کی کہ کوئی بادشاہ ہم پر مقرر کردو کہ اسکے ساتھ ہوکر ہم فی سبیل اللہ جہاد کریں، چنانچہ اس نبی نے انپر ایک بادشاہ مقرر کردیا، شروع میں انکے نبی نے بہت سمجھایا جنگ بڑی آزمائش کی چیز ہے اسکی تمنا نہ کرو، انہوں نے جذبات میں بھر کر یہ جواب دیا جب ہمارے گھر بار تک برباد ہوچکے تو آخر وہ کونسا دن ہوگا جب ہم جنگ کرینگے، لیکن انہوں نے انکے ساتھ پھر وہی کٹ حجتی جاری رکھی، آخر جب بڑی بحث کے بعد انکو جنگ کا حکم دیا گیا تو انمیں سے اکثر بھاگ نکلے اور صرف کچھ لوگ ہی باقی رہ گئے جو ثابت قدم رہے اور جنگ میں شریک ہوئے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے جسمیں انکے علاوہ جنگ کے اور دوسرے عواقب ونتائج پر تنبیہ کی گئی ہے: قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْا اَعِزَّةَ اَهْلِهَا اَذِلَّةً

وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ط (کہنے لگی بادشاہ جب گھستے ہیں کسی بستی میں اسکو خراب کر دیتے ہیں اور کر ڈالتے ہیں وہاں کے سرداروں کو بے عزت اور ایسا ہی کچھ کرینگے) (پارہ ۱۹ رکوع ۱۸) خلاصہ یہ ہے کہ قوی اور مضبوط بادشاہوں سے لڑنا ہنسی کھیل نہیں، انکی یہ عام عادت ہے کہ اگر وہ غالب آجائیں جیسا کہ ظنِ غالب ہوتا ہے تو ملوک اور سلاطین کی عام عادت کے موافق تمہارے ملک کو تہ وبالا کر کے رکھدینگے اور وہ انقلاب ایسا ہوگا جسمیں عزت والونکو ذلیل وخوار ہونا پڑے گا۔

لہٰذا بہتر یہ ہے کہ عواقب پر غور وخوض کئے بغیر جنگ کرنے میں عجلت پسندی سے کام نہ لیں بلکہ انکی طاقت، طبعی رجحانات، نوعیتِ حکومت اور اس بات کا پتہ لگائیں کہ انکی دھمکیوں کی پشت پر کونسی قوت کارفرما ہے اور یہ کہ واقعی طور پر وہ ہم سے کیا چاہتے ہیں اور ان تجاویز پر غور کریں کہ اگر جنگ کسی صورت سے بھی ٹل سکتی ہے تو زیادہ بہتر ہے ورنہ جو کچھ انکا رویہ معلوم ہوگا پھر مجبوراً اسکے مناسب کارروائی کرنے پڑیگی اور اسوقت جس چیز کی سب سے اہم ضرورت ہے وہ آخری دم تک صبر واستقامت ایثار وقربانی کی ہے صرف مالی

نہیں بلکہ جاہلی بھی عرب کا ایک بڑا شاعر باوجود خونخوار و فطرتاً جنگجو ہونے کے جنگ کے متعلق اپنے جذبات کو ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے ؎

فَلَمَّا صَرَّحَ الشَّرُّ نَا اَمْسٰی وَھُوَ عُرْیَانُ
وَلَمْ یَبْقَ سِوَی الْعُدْوَانِ دِنَّاھُمْ کَمَا دَانُوْا

یعنی جب جنگ کھل کر ہمارے سامنے آگئی اور جنگ کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار باقی نہ رہا تو پھر ہم نے بھی اُن کے کئے کا اچھی طرح ان کو مزہ چکھا دیا۔

اس موقعہ پر یہ بھی ہر وقت پیش نظر رہنا چاہیئے کہ اسلامی تعلیم و تاکید کے باوجود صدیوں سے ہماری زندگی فوجی باقی نہیں رہی ہے بلکہ عیش پرستی کی زندگی بن گئی ہے، اور ہم یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ جنگ کا مطلب یہ ہی کہ ہمارے ملک کے سپاہی کہیں ہم سے دور جا کر ملک کی حفاظت کی خاطر اپنے سر کٹوا آئینگے اور ہماری فتح یقینی ہوگی اور ہم اسطرح اپنے گھروں میں اطمینان و راحت کیساتھ کھاتے پیتے رہیں گے حالانکہ موجودہ جنگ میں سب سے پہلے دشمن کی نظروں میں دشمن کا نصب العین یہ رہتا ہی کہ ملک میں جو ترقیات بڑی مشقتیں اور محنتیں اٹھا کر اور بڑے

مصارف برداشت کر کے کسی حد تک کی ہیں سب سے پہلے ان کو
اپنا ہدف بنائے اور برباد کر ڈالے اور اتنا ہی نہیں عوام کی بھی
اسطرح خانہ ویرانی کر دے کہ عورت کا شوہر نہ رہے، بچے یتیم ہو جائیں،
ہری بھری کھیتیاں راکھ کا ڈھیر بنجائیں غرضکہ جو ملک بڑی
مصیبتیں جھیلکر سنبھلا تھا چند گھنٹوں میں قبرستان نظر آنے
لگے، اس ضمن میں جو موت کے گھاٹ اتر جائیں انکو چھوڑیئے،
لیکن جو باقی رہ جائیں گے انکو دَر دَر کی بھیک مانگنی پڑے،
پہننے کے لئے کپڑا نصیب نہ ہو اور سر چھپانے کیلئے کوئی گھر باقی نہ رہے۔

اب سوچئے اگر یہ مصائب کسی ملک پر خدانہ کردہ آپڑیں
تو اسکی مکافات ممکن ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو اسکے لئے کتنی مدت
درکار ہے، پھر اس درمیانی وقفہ کیلئے باقی ماندہ انسانوں کی
زندگی جسطرح گذریگی وہ بھی سامنے رکھنی چاہئے، چلئے اگر
فوجی اسپرٹ ہو تو اس جفاکشی کی کچھ نہ کچھ مشاقی قوم کے
اکثر افراد میں موجود ہوتی ہے لیکن جہاں ناشتہ کے بغیر ایک
قدم گھر سے باہر نکالا نہ جائے اور ہر وقت ایر کنڈیشن مکانوں
میں رہنے کی عادت ہو، بوٹ سوٹ پہننے غرضیکہ زندگی کے
ایک ایک شعبہ میں اتنی قیود گلے کا طوق بن چکی ہوں کہ انمیں سے

ایک کا بھی چھوڑنا قیامت معلوم ہو، اور اس سے تو شاید ہی عوام کا کوئی فرد آشنا ہو کہ آلاتِ جدیدہ تو در کنار کہ پستول اور بندوق بھی کسی جانور کا نام ہے۔

ان حالات میں آیات بالا کی روشنی میں یہ فیصلہ کر لینا اب آپ کا کام ہے کہ جنگ کا جلد بازی سے مول لینا بہتر ہے یا عارضی طور پر صبر کے تلخ گھونٹ بھر لینا بہتر ہے۔

چنانچہ ان ہی حقائق کے پیشِ نظر دنیا کی سب سے بڑی دو طاقتوں یعنی امریکہ اور روس نے منہ بہ منہ مقابل ہو کر پھر اپنے عزم کو فسخ کیا اور اسکی کوئی پروا نہیں کی کہ اس واپسی پر دنیا کیا ریمارک کسے گی، یہ دوسری بات ہے کہ طاقتور کو فتح ہو یا شکست ہر حالت میں وہ اسکو اپنی فتح سے تعبیر کرتا ہے، چھوٹے ملکوں کو چاہئے کہ وہ ان عظیم مملکتوں کے پختہ عزمِ جنگ اور پھر فوری خاموشی سے سبق حاصل کریں، صرف جوش کارآمد نہیں ہوتا اس کے ساتھ کچھ ہوش بھی درکار ہے۔

آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خلف بن حوشب نے جنگ کی مذمت میں چند اشعار نقل کئے ہیں وہ یہاں ہدیۂ ناظرین کر دئے جائیں وہ فرماتے ہیں کہ سلف ان اشعار کو پڑھنا پسند

فرماتے تھے :۔

اَلْحَرْبُ اَوَّلَ مَا تَكُوْنُ فُتَيَّةً تَسْعٰی بِزِيْنَتِهَا لِكُلِّ جَهُوْلٖ

جنگ اول اول تو ایک خوبصورت جوان عورت کی شکل میں نظر آتی ہے جو بناؤ سنگھار کر کے ہر جاہل آدمی کو اپنا فریفتہ بنا لیتی ہے۔

حَتّٰى إِذَا اشْتَعَلَتْ وَشَبَّ ضِرَامُهَا ؛ وَلَّتْ عَجُوْزًا غَيْرَ ذَاتِ حَلِيْلٖ

لیکن جب مشتعل ہو جاتی ہے اور اسکی لپٹیں بھڑکنے لگتی ہیں تو ایسی بد نما نظر آتی ہے جیسے بڑھیا عورت جس کا کوئی شوہر بھی نہ ہو یعنی اس کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوتا۔

شَمْطَاءَ يُنْكَرُ لَوْنُهَا وَتَغَيَّرَتْ مَكْرُوْهَةً لِلشَّمِّ وَالتَّقْبِيْلِ

ادھیڑ عورت کی طرح بن جاتی ہے جس کا نہ پہلا سا رنگ رہتا ہے نہ روپ اور نہ اس قابل رہتی ہے کہ کوئی شخص اسکی خوشبو سونگھنی پسند کرے یا اس کو منہ لگائے۔ (صحیح بخاری طبع ہند، باب الفتنۃ التی تموج کموج البحر ج ۲ ص ۱۰۵۱)

غیر مُلکی زبانوں کی حیثیت شرعی نظر میں

(۳۱) عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ رضی اللہ عنہ قَالَ اَمَرَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ اَتَعَلَّمَ لَهٗ كَلِمَاتٍ مِّنْ كِتَابِ يَهُوْدَ وَقَالَ اِنِّیْ وَاللّٰهِ مَا اٰمَنُ يَهُوْدَ عَلٰى كِتَابِیْ قَالَ فَمَا مَرَّ بِیْ نِصْفُ

شَهْرٍ حَتّٰی تَعَلَّمْتُہٗ لَہٗ قَالَ فَلَمَّا تَعَلَّمْتُہٗ کَانَ اِذَا کَتَبَ اِلٰی یَھُوْدَ کَتَبْتُ اِلَیْھِمْ وَاِذَا کَتَبُوْا اِلَیْہِ قَرَأْتُ لَہٗ کِتَابَھُمْ۔

ھٰذا حدیث حسن صحیح ترمذی صفحہ ۱۰۱ جلد ۲

ترجمہ: زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو حکم فرمایا کہ میں آپکے خطوط لکھنے کیلئے یہود کی زبان سیکھ لوں اور آپ نے فرمایا خدا کی قسم مجھ کو یہودیوں کے لکھنے پر کوئی اعتماد نہیں ہے یہ کہتے ہیں کہ ابھی نصف مہینہ بھی مجھ پر نہ گذرنے پایا تھا کہ میں نے آپکی خدمت کی خاطر ان کی زبان سیکھ لی، یہ کہتے ہیں کہ جب میں نے اسکو سیکھ لیا تو جب آپ کوئی خط یہود کو لکھتے تو آپکی طرف سے میں انکو لکھتا اور جب وہ کوئی خط آپکے نام لکھتے تو اسکو پڑھ کر آپکو سنا دیتا۔

شرح: امام ترمذیؒ نے اس حدیث پر بَابُ تَعْلِیْمِ السُّرْیَانِیَۃِ کا عنوان قائم کیا ہے کیونکہ اسوقت یہود کی زبان یہی سُریانی زبان تھی، اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے نزدیک اپنی ملکی زبان چھوڑ کر بوقتِ ضرورت غیر ملکی زبان سیکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور جب سریانی زبان کی اجازت ثابت ہوئی تو پھر ہماری ضروریات کا دائرہ جتنا وسیع ہوتا رہے اُن سب زبانوں کو سیکھنا ہمارا فرض ہونا چاہیئے۔

اس وقت جو کوتاہی جماعتی طور پر مجھ کو محسوس ہوتی ہے وہ
یہ ہے کہ ہم نے اپنے دماغوں میں مختلف زبانوں میں صرف
انگریزی زبان میں اپنی مساعی کا داعیہ محدود کر رکھا ہے اور
بے وجہ اسکو اپنے لئے مایۂ ناز اور طغرۂ امتیاز بنا رکھا ہے،
یہ بات ہمارے دورِ غلامی تک تو صحیح تھی لیکن آزادی کے بعد
بھی اگر انگریزی کے متعلق ہمارے جذبات وہی ہیں جو دورِ غلامی
میں تھے تو یہ قابلِ صد افسوس ہے ہمارے لئے اسکے دو نتائج
بہت مضرت رساں ہیں ایک تو یہ کہ انگریزی زبان کی بے وجہ
عزت رکھنے سے ہمارے قلوب میں بے وجہ انگریزوں کی عزت
قائم ہوتی ہے حالانکہ اب وہ ہمارے لئے اس سے زیادہ کوئی
حیثیت نہیں رکھتے جو دوسرے ممالک رکھتے ہیں، دوسرا
نقصان اسمیں یہ ہے کہ آزادی کے بعد جب ہمکو دوسرے ممالک
کیساتھ گفتگو کرنیکا واسطہ پڑتا ہے تو اپنے مافی الضمیر کی ادائیگی اور
انکے مافی الضمیر کے فہم میں ہمکو ترجمان کی ضرورت ہوتی ہے
اور یہ تو یقینی ہے کہ ہماری ترجمانی اُن وزنی الفاظ میں کوئی
دوسرا نہیں کر سکتا جو ہم خود کر سکتے ہیں اور دوسری بات یہ بھی
ہے کہ عمداً یا سہواً ترجمان سے غلط کرنا بھی ممکن ہے اور حدیث مذکور

میں جس نقطۂ نظر سے اپنے دشمن کی ترجمانی سے احتیاط کرنے کی تعلیم دی گئی ہے اسکی احتیاط رکھنا ہمارے لئے بھی لازم ہے، اس جگہ بے موقع نہ ہوگا اگر عربی زبان کی اہمیت کے متعلق بھی چند کلمات لکھدئے جائیں، میرے خیال میں جبکہ وحدتِ قومی کی بنیاد مذہب ہو نہ کہ وطن تو کم ازکم اس عقیدہ رکھنے والوں کیلئے عربی زبان کی اہمیت کا مسئلہ بدیہی ہونا چاہیئے، عالمِ اسلامی کے درمیان اسکی ضرورت میں آج کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا اور انمیں زبانوں کے اختلاف کے باوجود اگر کوئی زبان مشترک طور پر رائج ہوسکتی ہے تو وہ صرف ایک عربی زبان ہی ہے جب تک کوئی مشترک زبان ان ممالک میں عام طور پر رواج نہ پاجائے اسوقت تک انکے مابین اتحاد کی حقیقی روح پیدا ہونی مشکل ہے میں نے اپنی ابتدائی عمر میں ایک بڑے مبصر کی تالیف دیکھی تھی جس نے ایک بڑی قیمتی بات لکھی ہے وہ کہتا ہے کہ عالمِ اسلامی اگرچہ منتشر ہے اور چھوٹے چھوٹے حصوں میں بٹا ہوا ہے لیکن جنگی لحاظ سے جو اِن ممالک کا محلِ وقوع ہے وہ اتنی اہمیت رکھتا ہے جیسا ہندوستان کیلئے کبھی کوہِ ہمالیہ اہم تھا اسلئے اگر ان کے مابین

حقیقی وحدت پیدا ہو جائے خواہ وہ کسی ذریعہ سے ہو تو بڑی سے بڑی طاقت انکی محتاج نظر آئے گی، جغرافیائی مطالعہ رکھنے والے اس بیان کی اہمیت خوب محسوس کر سکتے ہیں۔

تعلیم و تربیت یا تزکیہ

مذکورۂ بالا حدیث کے تحت جو بحث کی گئی ہے وہ مختلف زبانوں کی تعلیم کے متعلق تھی لیکن ذیلی طور پر یہاں تربیت کی اہمیت کی طرف بھی متوجہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، یہ یاد رکھنا چاہئے کہ تعلیم خواہ کسی زبان کی ہو لیکن جب تک اسکے ساتھ تربیت اسلامی رنگ کی نہ کی جائے اسوقت تک تعلیم کے صحیح نتائج برآمد نہیں ہو سکتے، غالباً اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص صفات میں سے یُعَلِّمُهُمْ وَیُزَکِّیْهِمْ ارشاد فرمایا گیا ہے یعنی آپ اپنی امت کے لئے صرف ایک معلم ہی نہ تھے بلکہ ان کے مزکّی بھی تھے اس تزکیہ کی حقیقت کیا تھی یہ بہت تفصیل طلب ہے لیکن اگر اجمالاً تربیت کو درج کر دیا جائے تو بعید نہ ہو گا یہ بات اسوقت تک پوری واضح نہیں ہو سکتی جب تک کہ تربیتِ نبوت کی حقیقت بتائی نہ جائے

لیکن یہ بات بہت طویل ہے۔

تربیت میں سب سے پہلے معاشرتی اصلاح، اخلاق و اُولوالعزمی کا لحاظ رکھنا لازمی ہے اور صحت کے خیال کے ساتھ جفاکشی عنصر شامل رکھنا اور عیش پرستی سے اپنے نوجوانوں کو متنفر رکھنا، غریبوں کی ہمدردی کا جذبہ پیدا کرنا اور اپنے نفس کے اخراجات میں قدم قدم پر اعتدال کو ملحوظ رکھنا' باہمی تنافس کے بجائے تعاون وتناصر کی زندگی بسر کرنا، زندگی کے گوشہ گوشہ میں خودداری اور وقار کو قائم رکھنا، ایثار وقربانی کی روح پیدا کرنا وغیرہ وغیرہ، ان امور کو صرف ذہنی نہیں بلکہ انکی عملی زندگی میں داخل کردینا اور ان کی طبیعت وفطرت بنا دینا یہ لازمی ہے [1]

---

[1] تقسیم ہند سے قبل ایک مرتبہ افغانستان کی دعوت پر میرا جانا ہوا اسوقت وہ افغانستان کوئی دوسرا ہی افغانستان تھا، بادشاہ سے بھی ملاقات ہوئی لیکن وزیر اعظم کے ساتھ مجالست کا کچھ طویل اتفاق ہوا، دوران گفتگو میں انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ میں اپنے عہدہ کے لحاظ سے سات مختلف زبانیں جانتا ہوں لیکن اپنے گھر میں صرف اپنی پشتو بولتا ہوں اسی طرح ایک بڑے فوجی آفیسر سے ملاقات ہوئی تو میں نے یہ سمجھ کر کہ میری فارسی انکی وطنی فارسی سے ممکن ہے کچھ مختلف ہو اسلئے تبادلۂ خیالات کے لئے انگریزی زبان مناسب سمجھی تو اس نے بڑی نفرت کے ساتھ مجھ سے کہا کہ ہم انگریزی

بقیہ صفحہ ۱۲۷

اسلام حق مالکیت کو تسلیم کرتا ہے لیکن مالکوں پر یہ اخلاقی دباؤ ڈالتا ہے کہ جو مال انکی حاجت سے فاضل ہو اس کو وہ غریبوں کا ایک رزرو فنڈ سمجھیں

(۳۲) عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ رضی قَالَ بَیْنَمَا نَحْنُ فِیْ سَفَرٍ مَّعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذْ جَآءَہٗ رَجُلٌ عَلٰی رَاحِلَتِہٖ فَجَعَلَ یَضْرِبُ یَمِیْنًا وَّشِمَالًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ کَانَ مَعَہٗ فَضْلُ ظَہْرٍ فَلْیَعُدْ بِہٖ عَلٰی مَنْ لَّا ظَہْرَ لَہٗ وَمَنْ کَانَ لَہٗ فَضْلُ زَادٍ فَلْیَعُدْ بِہٖ عَلٰی مَنْ لَّا زَادَ لَہٗ قَالَ فَذَکَرَ مِنْ اَصْنَافِ الْمَالِ حَتّٰی رَاَیْنَا اَنَّہٗ لَا حَقَّ لِاَحَدٍ مِّنَّا فِیْ فَضْلٍ رواہ مسلم مشکوٰۃ صفحہ ۳۳۸

ترجمہ: ابو سعید خدری رض کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے کہ اچانک ایک شخص آپ کے سامنے آیا لیکن اسکا اونٹ اتنا تھکا ہوا تھا کہ جب وہ اسکو مارتا تو وہ دائیں بائیں

باقی حاشیہ صفحہ ۱۲۶ :- زبان نہیں جانتے اور نہ ہمکو اسکی ضرورت ہے اگر انگریز کو ہزار بار ضرورت ہو تو ہماری زبان میں ہم سے گفتگو کرے اس بیان پر میں کوئی تبصرہ نہیں کرتا صرف آزاد قوم کے جذبات بتانا منظور ہیں اور بس۔

مُڑجاتا مگر سامنے نہ چلتا یہ دیکھکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان فرمایا کہ جسکے پاس کوئی سواری اسکی ضرورت سے زائد ہو تو وہ اس شخص کو دیدے جسکے پاس سواری نہیں ہے اور جسکے پاس اپنی ضرورت سے زائد کچھ توشہ ہو تو وہ اسکو دیدے، جسکے پاس کچھ توشہ نہیں ہے اسی طرح آپ نے مختلف چیزوں کے متعلق ارشاد فرمایا، اس بارے میں آپنے اتنی تاکید فرمائی کہ آدمی کے پاس جو چیز بھی اسکی ضرورت سے زیادہ ہو اسمیں گویا اس کا کوئی حق ہی نہیں ہے (بلکہ اس کا فرض ہے کہ وہ اسکو اپنے دوسرے حاجتمند بھائی کو دیدے)

(۳۳) عَنْ جَابِرٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ کَانَتْ لَہٗ اَرْضٌ فَلْیَزْرَعْھَا اَوْ لِیَمْنَحْھَا اَخَاہُ فَاِنْ اَبٰی فَلْیُمْسِكْ اَرْضَہٗ۔ متفق علیہ مشکوٰۃ صفحہ ۲۵۷

ترجمہ: جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے پاس کوئی زمین کا ٹکڑا ہو اسکو چاہئے کہ یا تو خود اسمیں کھیتی کرے ورنہ اپنے بھائی کو دیدے کہ وہ اسمیں کھیتی کرے اور اگر یہ دونوں کام نہیں کرتا تو آپنے ناگواری کے لہجہ میں فرمایا کہ پھر اپنی زمین لئے بیٹھا رہے۔

شرح: ان ہر دو حدیثوں سے معلوم ہوا کہ اسلام حقِّ مالکیت تسلیم کرتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ انسان کا شرف ہے جو اسکے سِوا کسی اور جاندار کو بخشا نہیں گیا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص جد وجہد کر کے حلال طریقہ پر مال کماتا ہے تو اسکو اسکی ملکیت کیوں نہ تسلیم کیا جائے، اسی کے ساتھ جو عقولِ انسانیہ میں تفاوت ہے اور جفاکشی و محنت میں بھی بہت بڑا فرق ہے تو اگر مختلف انسان اپنی اپنی جد وجہد کے لحاظ سے حقوقِ ملکیت میں بھی مختلف رہیں تو اسکے معقول ہونے میں کیا شبہ ہے لیکن اسی کے ساتھ آپ نے دیکھا کہ اسلام ملکیت میں نفسِ حق تسلیم کرنے کے بعد اسکی تاکید کرتا ہے کہ فارغ البال شخص کا فرض ہے کہ وہ حاجتمند شخص کو اپنے کمائے ہوئے مال میں صرف شریک ہی نہ کرے بلکہ اس کو اس کا حقدار سمجھے۔ یہ تو اسلام کا نظریہ ہے۔

لیکن اسکے برخلاف اشتراکیت صرف زبانی طور پر انسان کے لئے حق ملکیت کا انکار کرتی ہے اور ایک اشرف المخلوقات کو اور دوسرے حیوانات کو ایک صف میں لا کر کھڑا کر دیتی ہے ایک جد وجہد کرنیوالا اور ایک فہیم و ذکی شخص اس دُوسرے

شخص کے ساتھ جو ان صفات میں اسکے ہم پلہ نہیں ہے برابر
رکھنا یہ بھی ان کا ایک نصب العین ہے، لیکن اسی کے ساتھ
جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ جو شخص ان میں بر سرِ اقتدار آجاتا ہے
وہ عوام کی تمام اسٹیٹ پر اسطرح قابض ہو کر مالکانہ تصرف
کرنا جائز سمجھتا ہے جو شاید حقیقی مالکین کو بھی حاصل نہیں ہے
اور عوام سے مشورہ کرنا تو در کنار انکو کانوں کان خبر بھی نہیں
ہونے دیتا اور اپنے لئے وہ تمام راحت کے سامان جائز تصور
کرتا ہے جو کوئی دوسرا حقیقی مالکیت رکھنے والا بھی مشکل سے
حاصل کر سکتا ہے۔

لہٰذا اب موازنہ کیجئے کہ حق مالکیت تسلیم کر کے خود مالک
کے ہاتھوں سے محتاجوں پر انکا حق سمجھ کر مال تقسیم کر دینا
زیادہ بہتر ہے یا مالکیت کا انکار کر کے صرف چند اشخاص کا
اس سے اپنی رائے کے مطابق اپنے منافع حاصل کرنا یہ بہتر
ہے، شریعت کو چھوڑیئے فطرت کے تقاضہ پر غور فرمایئے
کیا ہونا چاہیئے، میں مال کے علاوہ اور دوسرے انسانیت سوز
گوشوں سے اسوقت بحث کرنا نہیں چاہتا جسمیں ماں اور
بیوی کے درمیان بھی کوئی فرق نہ سمجھا جائے گویا وہ بھی مال

کی طرح اسٹیٹ کا ایک حق ہیں۔

اس کھلی ہوئی حیوانیت و بربریت کا اثر جو اس اشرف المخلوقات کے معاشرہ پر پڑ سکتا ہے اور پڑا ہے اسکو لکھتے ہوئے بھی قلم شرماتا ہے، لیکن یہ انسان کی فطرت ہے کہ جب وہ کوئی صحیح راستہ چھوڑ کر غلط راستہ اختیار کر لیتا ہے تو اسکو مختلف طریقوں سے معقول بنانے کی کوشش کرتا ہے اور اہلِ عقل و فہم پر گو ابتداءً اسکا بوجھ پڑے لیکن طاقت یا عادت کے بعد رفتہ رفتہ وہ اسکے ایسے عادی ہو جاتے ہیں کہ وہی انکو معقول حقیقت نظر آنے لگتی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے: اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا ط فَاِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ط (بھلا ایک شخص کہ بھلی سمجھائی گئی اُسکو اسکے کام کی بُرائی پھر دیکھا اُسنے اسکو بھلا کیونکہ اللہ بھٹکاتا ہے جسکو چاہے اور سجھاتا ہے جس کو چاہے) (سورہ الفاطر پارہ ۲۲ رکوع ۱۴) یعنی شیطان نے جسکی نگاہ میں بُرے کام کو بھلا کر دکھایا کیا وہ شخص اُسکے برابر ہو سکتا ہے جو خدا کے فضل سے بھلے بُرے کی تمیز رکھتا ہے، بہ الفاظ دیگر جو شخص شیطانی اغواء سے بُرائی کو بھلائی، بدی کو نیکی اور

زہر کو تریاق سمجھ لے کیا اس کے سیدھے راستے پر آنے کی کچھ توقع ہو سکتی ہے۔

اسلامی حکومت کا ایک اہم فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ کمزوروں کا حق بڑے لوگوں سے لیکر انکو دلوادے

(۲۴) اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَقْطَعَ لِعَبْدِ اللّٰہِ بْنِ مَسْعُوْدٍ الدُّوْرَ بِالْمَدِیْنَۃِ وَھِیَ بَیْنَ ظَھْرَانَیْ عِمَارَۃِ الْاَنْصَارِ مِنَ الْمَنَازِلِ وَالنَّخْلِ فَقَالَ بَنُوْ عَبْدِ بْنِ زُھْرَۃَ نَکِّبْ عَنَّا ابْنَ اُمِّ عَبْدٍ فَقَالَ لَھُمْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَلِمَ ابْتَعَثَنِیَ اللّٰہُ اِذًا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُقَدِّسُ اُمَّۃً لَا یُؤْخَذُ لِلضَّعِیْفِ فِیْھِمْ حَقُّہٗ۔

رویٰ فی شرح السنۃ   مشکوٰۃ صفحہ ۲۵۹

ترجمہ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن مسعودؓ کو زمین کا ایک قطعہ مدینہ منورہ میں عنایت فرمایا اتفاق سے زمین کا یہ ٹکڑا انصار کے باغات اور مکان کے درمیان میں واقع ہوا تھا (عبداللہ بن مسعودؓ مہاجر ہونیکی وجہ سے کچھ اجنبی سے تھے) اس پر بنو عبد زہرہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جاکر یہ درخواست پیش کی

کہ ابن ام عبد (عبد اللہ بن مسعودؓ کی کنیت) کو ہمارے مکانات سے کہیں علیحدہ زمین عنایت فرمائیں تو مناسب ہے اسپر آپنے گرانی کے لہجہ میں انکو یہ جواب دیا کہ اگر میں ایسا کروں تو اللہ تعالیٰ نے مجھ کو رسول بنا کر بھیجا کس مقصد کیلئے ہے' یاد رکھو اللہ تعالیٰ کسی جماعت کو اسوقت تک پاک نہیں کرتا کہ جب تک کہ انمیں کمزور کا جو حق ہے وہ اسکو نہ دلوا دیا جائے۔

شرح: اسلامی حکومت کا مقصد مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ بہت شائستہ انداز میں عوام و خواص کو حقوق اللہ اور عوام کے حقوق کی ادائیگی کا سلیقہ اسطرح سکھلایا جائے کہ وہ اپنی اندرونی اور بیرونی زندگی میں طبعی طور پر اسکے خوگر بن جائیں' لیکن جب کبھی غیر صالح شخصیتیں برسرِ اقتدار آجاتی ہیں تو یہ مقصد فوت ہو جاتا ہے اور رعایا کے درمیان عدل و انصاف کے ساتھ انکے حقوق کا تحفظ صحیح طور پر قائم نہیں رہتا، اور مختلف ناجائز راستوں سے عوام کے حقوق کا تو نظام بالکل درہم وبرہم ہو کر رہ جاتا ہے ایک بڑی شخصیت والا انسان جرائم کا ارتکاب کرتا ہے اور اپنے تعلقات یا حکومت کے اثرات یا مال و دولت کے بل بوتے پر جس غریب کو چاہے پیس ڈالتا ہے اور ایک غریب

انسان اگر اسکی داد و فریاد کرنا چاہے بھی تو اسکو سننے کے لئے
کوئی شخص تیار نہیں ہوتا حدیثِ مذکور میں بہت کھلے ہوئے
الفاظ میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ بعثت نبوت اور اسلامی حکومت
کا اصل مقصد یہ ہے کہ جو اسلام سے پہلے عوام کے حقوق تلف
ہو رہے تھے اسکا نظام از سرِ نو پھر درست کر دیا جائے اب غور
فرمائیے کہ یہاں شکایت کرنیوالے کون ہیں؟ اور انکی شکایت
کیا ہے؟ اور پھر یہ غور کیجئے کہ جس شخص کے متعلق یہ شکایت کی
گئی ہے وہ ملکی لحاظ سے کس حیثیت کا مالک ہے؟ اسکے بعد
پھر آپ کے فیصلے اور لب ولہجہ کے انداز پر بھی ذرا توجہ فرمائیے
یہاں شکایت کرنیوالے وہ انصار ہیں جنہوں نے قدم قدم پر
آپ پر جاں نثاری کا اور اپنی پوری پوری وفاداری کا ثبوت
دیا اور جب آپ کی قوم نے غدّاری کی تو انہوں نے اپنی سر اور
آنکھوں پر آپ کا بٹھانا اپنا فخر سمجھا اور شکایت صرف یہ ہے
کہ جس طرح ہر جماعت بالخصوص عرب اپنی اندرونی زندگی کو
آزادانہ رکھنا چاہتے تھے آئندہ بھی وہ اسی طرح آزاد رہے اور
جنکے متعلق شکایت ہے وہ اہلِ مکہ کے ایک مہاجر ہیں اور
گو مذہبی لحاظ سے بہت بڑے رتبہ کے مالک ہیں لیکن ہجرت

کے ابتدائی حالات میں ابھی تک کسی مشہور حیثیت کے مالک نہ تھے اسلئے
ان تازہ مہاجر کا انصار کو اپنے محلہ کے درمیان رہنا شروع شروع میں کچھ
قرین مصلحت معلوم نہیں ہوا ابھی تک مہاجرین اور انصار کے مابین رشتہ اور تعلقات کے
اتنے گہرے علائق قائم نہ ہوئے تھے کہ انصار اپنے ابتدائی دور میں اپنی قدیمی عادات
کے خلاف کوئی تاثر لیتے اسلئے انہوں نے آپکی خدمت میں بڑے ادب کے
ساتھ یہ درخواست پیش کی کہ زمین انکو ضرور دیجائے لیکن اگر
ہمارے محلہ سے کہیں الگ انکو زمین کا قطعہ دیدیا جائے تو
ہمارے اور انکے دونوں کے لئے مناسب ہوگا، لیکن چونکہ اس
واقعہ سے قبل آپ زمین کا وہ قطعہ انکو دے چکے تھے تو اس
جلیل القدر صحابی کی صرف نو وارد ہونے کی وجہ سے طاقتور
انصاریوں کے موافق فیصلہ دینا یہ حکومت اسلامی کے نظریہ کے
خلاف تھا، اسلئے آپنے کسی کی دلجوئی یا ناراضگی کی پرواہ کئے بغیر
انصار کی درخواست مسترد کردی اور بڑی ناگواری کے انداز میں
یہ فرمایا کہ اگر میں طاقتوروں کے مقابلہ میں ضعیفوں کے حق
دلوانے میں کوئی پس وپیش کروں تو پھر میری بعثت کا جو اہم
مقصد ہے وہی فوت ہوجاتا ہے، سوچئے کہ اگر آپ بالفرض
کسی دوسرے مقام پر انکو کوئی قطعۂ زمین اس سے بڑا عطا

فرما دیتے تو کوئی مضائقہ بھی نہیں تھا لیکن چونکہ یہ اصولی طور
پر ایک غلط مثال قائم ہوتی تھی اسلئے آپ نے پہلے ہی قدم پر
اسکو اتنی سختی کے ساتھ روک دیا کہ آئندہ کسی کے دماغ میں
اس قسم کے خیالات کا تصور بھی پیدا نہ ہونے پائے پھر بہت
جلد یہ نقشہ بدلا اور انصار اور مہاجر مل جل کر اسطرح رہنے
لگے گویا وہ شیر و شکر تھے، بدقسمتی سے اس وقت اُس بلند نظریہ
پر عمل کرنا تو درکنار اسکے برخلاف تعلقات وطنی، تعصب اور
بڑے اور چھوٹے کا فرق اسطرح پیدا ہوگیا ہے گویا ہماری حکومتوں
کے قیام کی بنیاد اسی پر ہے اور یہ ہم سمجھ چکے ہیں کہ اگر ہم اس غلط
طریق کو اختیار نہ کریں تو ہمارے ذاتی اقتدار کا بقا ہی مشکل ہو
اور میں یہ یقین رکھتا ہوں اور اسکو دُہرائے بغیر نہیں رہ سکتا
کہ یہ تمام نتائج شرعی نظام سے غفلت اور قادر مطلق کی
ذات سے بے خوفی کے ہیں۔

سرکاری سزاؤں میں سفارش کرنیکا حق کسی کو نہیں

(۳۵) عَنْ عَائِشَةَ رض اَنَّ قُرَيْشًا اَهَمَّهُمْ شَأْنُ الْمَرْأَةِ
الْمَخْزُوْمِيَّةِ الَّتِيْ سَرَقَتْ فَقَالُوْا مَنْ يُّكَلِّمُ فِيْهَا رَسُوْلَ اللّٰهِ

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالُوْا وَمَنْ یَّجْتَرِئُ عَلَیْہِ اِلَّا
اُسَامَۃُ بْنُ زَیْدٍ حِبُّ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَکَلَّمَہٗ
اُسَامَۃُ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَتَشْفَعُ فِیْ
حَدٍّ مِّنْ حُدُوْدِ اللّٰہِ ثُمَّ قَامَ فَاخْتَطَبَ ثُمَّ قَالَ اِنَّمَا اُھْلِکَ
الَّذِیْنَ قَبْلَکُمْ اَنَّھُمْ کَانُوْا اِذَا سَرَقَ فِیْھِمُ الشَّرِیْفُ تَرَکُوْہُ
وَاِذَا سَرَقَ فِیْھِمُ الضَّعِیْفُ اَقَامُوْا عَلَیْہِ الْحَدَّ وَاَیْمُ اللّٰہِ
لَوْاَنَّ فَاطِمَۃَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ یَدَھَا۔

متفق علیہ صنفہ ۳۱۴

ترجمہ: حضرت عائشہ رضؓ سے روایت ہے کہ بنی مخزوم خاندان کی ایک شریف
عورت نے چوری کے جرم کا ارتکاب کیا تو اسکے معاملہ میں قبیلۂ قریش کو
بڑی فکر دامنگیر ہوگئی (کہ اگر چوری کی سزا اس پر نافذ ہوگئی تو بڑی
بدنامی کی بات ہوگی) اس بارے میں اُن میں یہ گفتگو ہونے لگی کہ
کوئی ایسا شخص ہے جو اس شریف خاندان عورت کیلئے آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض معروض کر سکے، تو اسپر یہ بات
طے ہوئی کہ بھلا اس بات کی کون ہمت کر سکتا ہے ہاں اگر اسامہ بن زیدؓ
ہمت کر جائیں تو کر جائیں کیونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے
لاڈلے ہیں، چنانچہ اس معاملہ میں ہمت کر کے اسامہ بن زیدؓ نے آپ کی

خدمت میں سفارش کی، اسپر آنحضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی تنبیہ کے لہجہ میں فرمایا کہ اسامہ کیا تم خدائی تعزیر کے معاملہ میں بھی سفارش کرتے ہو؟ اسکے بعد آپنے اتنے ہی پر کفایت نہیں کی بلکہ اسکی اتنی اہمیت محسوس کی کہ منبر پر کھڑے ہو کر یہ خطبہ دیا کہ تم سے پہلے لوگ اسی جرم کی پاداش میں ہلاک کئے گئے ہیں کہ ان میں یہی بُری رسم پڑ گئی تھی کہ جب انمیں کوئی شریف آدمی جرم کا مرتکب ہوتا تو اُسے رہنے دیتے اور اگر کوئی معمولی آدمی چوری کا ارتکاب کرتا تو جھٹ اسپر سزا کا حکم کر دیتے، اسکے بعد آپنے خدا کی قسم کھا کر فرمایا کہ فاطمہ جو میری بیٹی ہے (معاذ اللہ) اگر اس جرم کا ارتکاب کرے تو میں اسپر بھی شرعی سزا نافذ کروں گا۔

(اعاذنا اللہ منہ)

شرح: سرکاری سزا سے مُراد یہاں قانون تعزیرات کا ایک خاص حصہ ہے جسکو اصطلاح میں "حدود" کہا جاتا ہے یعنی وہ سزائیں جو خدا تعالیٰ کیطرف سے مُعیّن کر دی گئی ہیں اور انمیں حاکم کیلئے کمی وبیشی کا کوئی اختیار نہیں رکھا گیا ہے، مثلاً زنا اور چوری کی سزا اور معترضین کی نظر میں یہی دو سزائیں وہ ہیں جو انکو کھٹکتی ہیں ورنہ اسلام کی عام تعزیرات

یں بڑی سہولت قائم رکھی گئی ہے اور ان دو سزاؤں کو اگر
ذیلی دفعات کے ساتھ دیکھا جائے تو پھر اسمیں کوئی شدت
بھی باقی نہیں رہتی، اسوقت تو جس بات پر تنبیہ کرنی ہے وہ یہ ہے
کہ حدود کے سوا بعض جرائم وہ ہیں جنکی سزاؤں میں کمی و بیشی
کرنیکا حاکم کو اختیار دیا گیا ہے انمیں اسلامی قانون تعزیرات
میں انتہا درجہ کی سہولت قائم رکھی گئی ہے مثلاً شریف اور
شریر کا فرق، اتفاقیہ اور عادت کا فرق اور اس قسم کے امور
کی پوری پوری رعایت رکھی گئی ہے اور حکّام کو اسکی ہدایت
کی گئی ہے کہ وہ سزا دینے سے قبل اس پر غور کریں کہ وہ مجرموں
کی شخصیت اور انکی طبائع کا لحاظ رکھیں اور اسکا اندازہ کریں
کہ بعض اوقات سزا کا نفاذ کر دینا باعثِ انسدادِ جرائم ہوتا
ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شریف طبائع معافی کا جتنا اثر
لیتی ہیں اتنا اثر سزا کا نہیں لیتیں، لیکن یہ سب رعایتیں
حدود کے باب کے علاوہ دوسری قسم کی سزاؤں میں ہیں اور حدود
میں بھی قانوناً حاکم کیلئے اسکے ثبوت کے دلائل پر غور و خوض
کرنے کیلئے اتنے شرائط مقرر کئے گئے ہیں کہ وہ ہر جگہ آسانی
سے مہیا نہیں ہو سکتے، لیکن اگر کسی مقام پر معاشرہ کی بُری

اور ماحول کی صلاحیت کی وجہ سے وہ شرائط پورے طور پر موجود ہو جائیں تو حاکم پر یہ فرض کر دیا گیا ہے کہ وہ اس سزا کو بلا کسی پس وپیش اور بلا کسی تفریق نافذ کر دے، کیونکہ مذکورہ بالا جرائم کے اثرات شرعی نظر میں خطرناک بھی ہیں اور متعدی بھی اور امراضِ متعدیہ میں آج بھی اس قسم کے مریضوں کے ساتھ تندرستوں کی مخالطت ممنوع سمجھی جاتی ہے اور ان سے اجتناب و پرہیز ضروری سمجھا جاتا ہے خواہ وہ ان کے عزیز ہی کیوں نہ ہوں، یہ اچھی طرح واضح رہنا چاہئے کہ اسلامی قانونِ تعزیرات کا مقصد نظم ونسق قائم رکھنا ہے صرف سزا دینا مقصود نہیں اسلئے جو جرائم ناقابلِ برداشت ہیں ان کی سزائیں بھی سخت مقرر کرنی ناگزیر ہے۔

جو لوگ غور وخوض کئے بغیر اسلامی تعزیرات پر محض انگریزوں کی تقلید میں نکتہ چینی کرنے کے لئے زبانیں کھول دیتے ہیں وہ اپنی زبانیں بند کرلیں اور پھر آنکھ کھولکر دیکھیں کہ انکے موجودہ قانونِ تعزیرات نے جرائم کا انسداد کر دیا یا اس میں اور اضافہ کر دیا اور پھر عارضی طور پر ہی سہی اسلامی قانونِ تعزیرات کو نافذ کر کے دیکھیں کہ جرائم کا انسداد ہوتا ہے

کہ نہیں اتنی بھی ہمت نہ ہو تو ذرا ان ممالک کے اوپر ہی نظر ڈال لیں جہاں پر یہ قوانین کسی حد تک نافذ ہیں، تعزیرات کا منشا، مجرم کو راحت دینا نہیں بلکہ خلق اللہ کو راحت دینا ہے اگر اس پر نظر کر لی جائے اور عیسائیوں کے اعتراضات کا خوف دل سے نکال ڈالا جائے تو اسلامی قانونِ تعزیرات سے بہتر کوئی دوسرا قانون نہیں ہو سکتا افسوس ہے کہ اسوقت یہ میرا موضوع نہیں ہے اسلئے اسکی تفصیل نہیں کی جا سکتی۔

حکومت کو غلط مشیروں سے بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے

(۳۶) عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ رضؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا بَعَثَ اللّٰہُ مِنْ نَّبِیٍّ وَّلَا اسْتَخْلَفَ مِنْ خَلِیْفَۃٍ اِلَّا کَانَتْ لَہٗ بِطَانَتَانِ بِطَانَۃٌ تَأْمُرُہٗ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَحُضُّہٗ عَلَیْہِ وَبِطَانَۃٌ تَأْمُرُہٗ بِالشَّرِّ وَتَحُضُّہٗ عَلَیْہِ وَالْمَعْصُوْمُ مَنْ عَصَمَہُ اللّٰہُ۔ رواہ البخاری۔ مشکوٰۃ صفہ ۳۲۱

ترجمہ: ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ نے جو بھی نبی اور خلیفہ بنایا ہے اسکے ساتھ دو قسم کے مشیر ضرور رکھے ہیں ایک مشیر وہ جو نیک کاموں کے لئے اسکو مشورہ دیتا تھا اور اسکی

ترغیب بھی دیتا تھا اور دوسرا وہ جو برائی کا مشورہ دیتا تھا اور اسی
کی ترغیب دلاتا تھا اور برائی سے وہی بچتا ہے جس کو خدا ہی بچائے۔
شرح: نسائی شریف میں اس حدیث کی تشریح میں حضرت
عائشہ رضی اللہ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یوں
نقل فرماتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب مسلمانوں کے امیر کیساتھ
خیر کا ارادہ فرماتا ہے تو اسکے لئے سچا وفادار وزیر مقرر فرما دیتا
ہے جسکا کام یہ ہوتا ہے کہ اگر غفلت سے امیر کسی بھلے کام کو
بھول جائے تو وہ اسکو یاد دلا دیتا ہے اور اگر اس کو یاد ہو تو
اسکو عملی جامہ پہنانے میں اس کی مدد کرتا ہے اور اگر خدا نہ
کردہ مشیتِ الٰہیہ کچھ اور ہوتی ہے تو اسکے لئے بُرا وزیر مقدر
فرما دیتا ہے جسکا کام یہ ہوتا ہے کہ کوئی کارِ خیر اگر امیر بھول جائے
تو اسکو یاد نہیں دلاتا اور اگر اسکو یاد ہو تو اسے کرنے میں
روڑے اٹکاتا ہے۔ (مشکوٰۃ شریف صفہ ۳۲۲)
علماء نے لکھا ہے کہ ان دو مشیروں سے مُراد ایک فرشتہ
اور دوسرا شیطان ہے اور دونوں کی اپنی اپنی خدمات
خیر و شر کی معلوم ہیں لیکن انبیاءؑ تو عصمتِ خداوندی کی وجہ
سے شیطان کے شر سے یقیناً محفوظ رہتے ہیں اور انکے علاوہ

جو خلفاء انکے قدم بقدم چلتے ہیں انکو بھی خدا تعالیٰ شیطان کے فریب سے محفوظ رکھتا ہے، یہ دو وہ قوتیں ہیں جنکا ادراک عام انسانوں کو نہیں ہوتا اسی لئے شریعت نے اُن پر متنبہ کیا ہے اسی طرح ہر حکومت کے ساتھ بھی اسکے مشیر دو قسم کے ہوتے ہیں اور بھی ظاہری طور پر اپنی فطرت کے مطابق حکومت کو اچھے بُرے مشورے دیتے رہتے ہیں اور جب ایک ضعیف انسان دو متضاد مشیروں کے پھندے میں پھنس جاتا ہے تو پھر اسکے ساتھ اگر خدائی مدد نہ ہو تو بسا اوقات غلط مشیروں کی چرب لسانی اور فریب کاری میں پھنسکر رہ جاتا ہے، اسلئے حاکم کا فرض ہے کہ وہ مشورہ تو ضرور لے لیکن کسی مشیر کو اپنی پارٹی میں شامل نہ کرے اور نہ خود اسکی پارٹی میں شامل ہو۔ اور حاکم کی قابلیت کا معیار یہی ہے کہ وہ آنکھ بند کر کے کسی پر اعتماد کی بجائے اپنے خدا پر بھروسہ کر کر اپنے عزم سے وہ راہ اختیار کرے جس میں کسی پارٹی کے بجائے مخلوقِ خدا کی بھلائی ہو۔

خوب یاد رکھئے! کہ حکومت کی صلاحیت کا معیار صرف یہ ہے کہ وہ اقتدار و اختیار کی باگ ڈور سنبھالنے کے بعد خدا کی ضعیف مخلوق کے ساتھ کیسا سلوک کرتا ہے؟

دو دشمنوں میں سے اگر کسی مصلحت سے ایک کے ساتھ ساز کرنا ناگزیر ہو جائے تو کس کے ساتھ ساز کرنا چاہیئے

(۳۷) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍؓ فِي قَوْلِهٖ تَعَالٰى الٓمّٓ غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِيْ اَدْنَى الْاَرْضِ قَالَ غُلِبَتْ وَغَلَبَتْ قَالَ كَانَ الْمُشْرِكُوْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ يَّظْهَرَ اَهْلُ فَارِسَ عَلَى الرُّوْمِ لِاَنَّهُمْ وَاِيَّاهُمْ اَهْلُ الْاَوْثَانِ وَكَانَ الْمُسْلِمُوْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ يَّظْهَرَ الرُّوْمُ عَلٰى فَارِسَ لِاَنَّهُمْ اَهْلُ كِتٰبٍ فَذَكَرُوْهُ لِاَبِيْ بَكْرٍؓ فَذَكَرَهٗ اَبُوْبَكْرٍؓ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَمَا اِنَّهُمْ سَيَغْلِبُوْنَ فَذَكَرَهٗ اَبُوْبَكْرٍ لَّهُمْ فَقَالُوْا اجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ اَجَلًا فَاِنْ ظَهَرْنَا كَانَ لَكَ كَذَا وَكَذَا وَاِنْ ظَهَرْتُمْ كَانَ لَكُمْ كَذَا وَكَذَا فَجَعَلَ اَجَلَ خَمْسِ سِنِيْنَ فَلَمْ يَظْهَرُوْا فَذَكَرُوْا ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَلَا جَعَلْتَهٗ اِلٰى دُوْنَ قَالَ اَرَاهُ الْعَشْرَ قَالَ قَالَ سَعِيْدٌ وَّالْبِضْعُ مَا دُوْنَ الْعَشْرِ قَالَ ثُمَّ ظَهَرَتِ الرُّوْمُ بَعْدُ قَالَ فَذٰلِكَ قَوْلُهٗ تَعَالٰى الٓمّٓ غُلِبَتِ الرُّوْمُ اِلٰى قَوْلِهٖ وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ بِنَصْرِ اللّٰهِ قَالَ سُفْيَانُ سَمِعْتُ اَنَّهُمْ ظَهَرُوْا

عَلَيْهِمْ يَوْمَ بَدْرٍ۔ هٰذَا الْحَدِيْثُ حَسَنٌ صَحِيْحٌ غَرِيْبٌ۔

ترمذی ابواب التفسیر

ترجمہ: ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ آیت الٓمّٓ غُلِبَتِ الرُّوْمُ الخ
کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ آیۂ کریمہ میں لفظ غُلِبَتْ دو طرح پڑھا گیا
ہے یعنی معروف بھی مجہول بھی (یہ علم نحو کی اصطلاحیں ہیں) وہ یہ
بیان فرماتے ہیں روم اور فارس کی جنگ میں مشرکوں کی دلی خواہش
تو یہ تھی کہ اہلِ فارس رومیوں پر غالب آجائیں کیونکہ وہ دونوں
شرک اور بت پرستی میں مشترک تھے اور مسلمانوں کی تمنا یہ تھی کہ روم
والے اہلِ فارس پر غالب آجائیں کیونکہ رومی گو کافر سہی مگر پھر بھی
اہلِ کتاب تھے (اسلئے رومی بہ نسبت اہلِ فارس کے مسلمانوں سے
قریب تر تھے) لہٰذا یہ بات انہوں نے صدیق اکبرؓ سے ذکر کی، حضرت
ابوبکر صدیقؓ نے یہ خیالات آپ کی خدمت میں عرض کئے تو آپ نے
ارشاد فرمایا رومی اہلِ فارس پر فتح پائینگے چنانچہ ابوبکرؓ نے یہ بات
مشرکوں سے کہہ دی اسپر انہوں نے کہا اچھا تو اسکی کوئی مدت مقرر
کرلو (تاکہ اس درمیان میں تمہارے صدق و کذب کا فیصلہ ہو جائے)
اگر ہماری بات اونچی رہی تو تم کو اتنا مال دینا پڑیگا اور اگر تمہاری
بات سچی ثابت ہوئی تو ہم تمکو اتنا اتنا مال دینگے" اس زمانہ تک

بازی اور مال کی شرط لگانی اسلام میں درست تھی بعد میں منسوخ ہوگئی"، اس پر صدیقؓ نے اپنی رائے سے پانچ سال کی مدت مقرر کردی مگر اس درمیان میں اہلِ فارس کو فتح حاصل ہوگئی "گویا صدیق اکبرؓ شرط میں ہار گئے"، صدیق اکبرؓ نے یہ بات جاکر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی، آپنے فرمایا کہ تم نے دس سال سے کم مدت مقرر کیوں نہ کی" اور پانچ سال کی تحدید کیسے کردی" کیونکہ قرآن میں اس پیشینگوئی میں لفظِ بضع آیا ہے جسکا اطلاق تین سے زیادہ اور دس سے کم پر ہوتا ہے، راوی بیان کرتا ہے کہ اس واقعہ کے بعد آخرکار یوں ہی ہوا کہ دس سال کے اندر ہی اندر رومی غالب آگئے، چنانچہ لفظ غَلَبَتْ جو بصیغہ معروف پڑھا گیا تھا اسکی تصدیق ہوگئی اور اس پیشینگوئی کا ظہور ٹھیک اپنے وقت مقرر میں ہوگیا اور مسلمان اسکی خوشیاں منانے میں مصروف ہوگئے، سفیان کہتے ہیں کہ رومیوں کی یہ فتح جنگ بدر کے موقع پر سننی نصیب ہوئی اسلئے انکو دوہری خوشی ہوئی ایک بدر میں کامیابی کی دوسرے پرانی پیشینگوئی کے ظہور کی۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت شریفہ کے متعلق اپنے فوائد میں تحریر فرماتے ہیں کہ نو سال کے اندر اندر رومی غالب ہوجائینگے کیونکہ لغت میں اور

حدیث میں "بضع" کا اطلاق تین سے نو تک پر ہوا ہے' ان آیات میں قرآن نے ایک عجیب وغریب پیشینگوئی کی جو اس محالفت کی عظیم الشان دلیل ہے' واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ کی بڑی بھاری دو سلطنتیں "فارس" (جسے ایران کہتے ہیں) اور "روم" مدت دراز سے آپسمیں ٹکراتی چلی آتی تھیں ۶۰۲ء سے لیکر ۶۱۴ء کے بعد تک انکی حریفانہ نبرد آزمائیوں کا سلسلہ جاری رہا کیا جیسا کہ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (ENYCLPAEDIA BRITANNICA) کی تصریحات سے ظاہر ہے' ۵۷۰ء میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ اور چالیس سال بعد ۶۱۰ء میں آپ کی بعثت ہوئی مکہ والوں میں جنگ روم وفارس کے متعلق خبریں پہنچتی رہتی تھیں اسی دوران میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت اور اسلامی تحریک نے ان لوگوں کیلئے ان جنگی خبروں میں ایک خاص دلچسپی پیدا کر دی' فارس کے آتش پرست مجوس کو مشرکین مکہ مذہباً اپنے سے نزدیک سمجھتے تھے' اور روم کے نصاریٰ اہل کتاب ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے بھائی یا کم از کم انکے قریبی دوست قرار دیئے جاتے تھے جب فارس کے غلبہ کی خبر آتی مشرکین مکہ مسرور ہوتے اور اس سے مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنے غلبہ کی

فال لیتے اور خوش آئند توقعات باندھتے تھے مسلمانوں کو بھی
طبعاً صدمہ ہوتا کہ عیسائی اہل کتاب آتش پرست مجوسیوں سے
مغلوب ہوں ادھر انکو مشرکینِ مکہ کی شماتت کا ہدف بننا پڑے
آخر ۶۱۴ء کے بعد (جبکہ ولادت نبوی کو قمری حساب سے تقریباً
پینتالیس سال اور بعثت کے پانچ سال گذر چکے) خسرو پرویز
(کیخسرو ثانوی) کے عہد میں فارس نے روم کو ایک مہلک اور
فیصلہ کُن شکست دی، شام، مصر، ایشیائے کوچک وغیرہ سب
ممالک رومیوں کے ہاتھوں سے نکل گئے، ہرقل قیصر روم کو ایرانی
لشکر نے قسطنطنیہ میں پناہ گزین ہونے پر مجبور کر دیا اور رومیوں
کا دار السلطنت بھی خطرہ میں پڑ گیا، بڑے بڑے پادری قتل یا
قید ہو گئے، بیت المقدس سے عیسائیوں کی سب سے زیادہ مقدس
صلیب بھی ایرانی فاتحین لے اُڑے، قیصرِ روم کا اقتدار بالکل فنا
ہو گیا، بظاہر اسباب کوئی صورت روم کے اُبھرنے اور فارس کے
تسلط سے نکلنے کی باقی نہ رہی، یہ حالات دیکھ کر مشرکینِ مکہ نے
خوب بغلیں بجائیں، مسلمانوں کو چھیڑنا شروع کیا، بڑے بڑے
حوصلے اور توقعات قائم کرنے لگے حتیٰ کہ بعض مشرکین نے
ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آج ہمارے بھائی ایرانیوں نے

تمہارے بھائی رومیوں کو مٹا دیا ہے کل ہم بھی تمہیں اسی طرح مٹا ڈالیں گے، اسوقت قرآن نے سلسلۂ اسباب ظاہری کے بالکل خلاف عام اعلان کر دیا کہ بیشک اسوقت رومی فارس سے مغلوب ہو گئے ہیں لیکن نو سال کے اندر اندر وہ پھر غالب و منصور ہونگے اسی پیشینگوئی کی بنا پر حضرت ابو بکر صدیق رضؓ نے بعض مشرکین سے شرط باندھ لی (اسوقت تک ایسی شرط لگانا حرام نہ ہوا تھا) کہ اگر اتنے سال تک رومی غالب نہ ہوئے تو میں سو اونٹ تم کو دُونگا ورنہ اسی قدر اونٹ تم مجھکو دو گے، شروع میں حضرت ابو بکر رضؓ نے اپنی رائے سے "بِضعِ سِنِینَ" کی میعاد کچھ کم رکھی تھی، بعدہٗ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے "بِضع" کے لغوی مدلول یعنی نو سال پر معاہدہ ٹھہرا، ادھر ہرقل قیصرِ روم نے اپنے زائل شدہ اقتدار کو واپس لینے کا تہیہ کر لیا اور مَنّت مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھ کو فارس پر فتح دی تو "حمص" سے پیدل چلکر "ایلیا" (بیت المقدس) تک پہنچوں گا، خدا کی قدرت دیکھو کہ قرآنی پیشینگوئی کے مطابق ٹھیک نو سال کے اندر (یعنی ہجرت کا ایک سال گذرنے پر) عین بدر کے دن جبکہ مسلمان اللہ کے فضل سے مشرکین پر نمایاں فتح و نصرت حاصل

ہونے کی خوشیاں منا رہے تھے، یہ خبر سنکر اور زیادہ مسرور ہوئے کہ رومی اہل کتاب کو خدا تعالیٰ نے ایران کے مجوسیوں پر غالب فرمایا اور اس ضمن میں مشرکینِ مکہ کو مزید خذلان و خسران نصیب ہوا قرآن کی اس عظیم الشان اور محیر العقول پیشینگوئی کی صداقت کا مشاہدہ کر کے بہت لوگوں نے اسلام قبول کیا اور حضرت ابو بکرؓ نے سو اونٹ مشرکینِ مکہ سے وصول کیے جنکے متعلق حضور نے حکم دیا کہ صدقہ کر دیے جائیں۔ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ عَلٰى نَعْمَائِهِ الظَّاهِرَةِ وَالْاٰئِهِ الْبَاهِرَةِ۔ یعنی پہلے فارس کو غالب کرنا روم کو مغلوب کرنا اور پیچھے حالات کو الٹ دینا، سب اللہ کے قبضہ میں ہے صرف اتنی بات سے کسی قوم کے مقبول و مردود ہونیکا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ وَتِلْكَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ (اور یہ دن باری باری بدلتے رہتے ہیں ہم ان لوگوں میں) (پارہ ۴ رکوع ۵) ایک تو اس دن اپنی فتح کی خوشی اس پر مزید خوشی یہ ہوئی کہ رومی اہلِ کتاب (جو نسبتہً مسلمانوں سے اقرب تھے) فارس کے مجوسیوں پر غالب آئے قرآن کی پیشینگوئی کی صداقت کا لوگوں نے مشاہدہ کر لیا، کفارِ مکہ کو ہر طرح ذلت نصیب ہوئی۔

شیخ الاسلامؒ کے یہ فوائد اسلئے نقل کئے گئے ہیں تاکہ آپ کو حدیثِ مذکورہ میں ذکر شدہ واقعہ کا تھوڑا سا تاریخی پسِ منظر معلوم ہو جائے اسکے بعد یہ عرض کرنا ہے کہ قرآن جب دنیا میں آیا تو فطری طور پر اسکے مخاطبین دو قسموں میں بٹ گئے، ایک وہ جنہوں نے اسکو سچا مانا اور اسکو تسلیم کیا وہ مسلمان کے لقب سے پکارے گئے، دوسرا گروہ وہ جنہوں نے اسکو جھٹلایا اور اسکا انکار کیا وہ منکرین کی صف میں شمار ہوئے اور انکا لقب کافر قرار پایا، اسلامی نقطۂ نظر میں منکرین کی پارٹی اگرچہ اجمالاً ایک ہی صف میں شامل رہی ہے لیکن تاہم ان میں کتبِ سماویہ کے نزول کی وجہ سے اہلِ کتاب اور غیر اہلِ کتاب ہونے کا فرق قائم رکھا گیا ہے یعنی جس جماعت میں خدا کی کوئی کتاب اُتری اگرچہ اسکے حاملین نے اسکی ناقدری کر کے اسکی ایسی تحریف کی کہ اپنی اصلی شکل وصورت میں وہ باقی نہ رہ سکی اور اس لحاظ سے وہ محرف ہو کر ایک طریقہ پر دنیا سے گویا نیست ونابود ہو گئی تاہم اس قوم کی نسبت ایک نازل شدہ کتاب کی طرف باقی رہی اور مسلمانوں کی نظروں میں اس لحاظ سے انکا رشتہ ان کافروں سے پھر بلند رہا جنکے پاس جنکو کسی آسمانی کتاب سے کوئی نسبت صحت

کے ساتھ ثابت نہیں ہوتی اگر کسی نازل شدہ کتاب کی طرف وہ خود اپنی نسبت کرتے ہیں تو یہ صرف ان کا اپنا دعویٰ ہے جسکا کوئی ثبوت نہ انکے ہاتھ میں ہے اور نہ تاریخ سے اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے، یہی وجہ تھی کہ حدیث مذکور میں رومیوں کی فتح پر انکے اہل کتاب ہونیکی وجہ سے مجوسیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کو بہت خوشی حاصل ہوئی یہ ایک وقتی بات تھی جو اس وقت مقابلہ کی وجہ سے پیش آئی لیکن تاہم اسمیں ہمارے لئے ایک سبق ہے اور بہت اہم سبق ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر دو دشمن ہمارے سامنے ہوں تو اگرچہ دشمن ہونے میں وہ دونوں برابر ہوں لیکن اگر کسی مصلحتِ وقتی کی بناء پر ہم کو کسی کیساتھ ساز کرنا ناگزیر ہو جائے تو ہم کو ترجیح کس کو دینی چاہیئے۔

قرآن کریم نے جس حقیقت کا جگہ جگہ اعلان فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ کافر خواہ وہ کسی فریق میں داخل ہو اسکے ساتھ قلبی محبت رکھنا یعنی اسکے ساتھ دوستی رکھنا، اس پر اعتماد کرنا ایک لمحہ کیلئے بھی جائز نہیں چہ جائیکہ انکو اپنے معاملات میں مشیر بنانا اور ان سے مشورہ طلب کرنا اسکو تو حد درجہ کی حماقت قرار دیا گیا ہے اور تاریخی اور عقلی طور پر مختلف

مقامات میں اسکو ثابت کیا گیا ہے، اگر میں اُن آیات کا
استیعاب کروں توجس اختصار کو ہر جگہ پر اختیار کرتا آیا ہوں
وہ یہاں میرے ہاتھ سے چھوٹ جائیگا تاہم مشتے نمونہ از خروارے
ایک آیت تحریر کرتا ہوں جس سے آپ قرآنی نقطۂ نظر کا
اندازہ فرما سکتے ہیں:۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا
بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا یَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ط وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ج
قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ج وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُهُمْ
اَكْبَرُ ط قَدْ بَیَّنَّا لَكُمُ الْاٰیٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ○
هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا یُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ
بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ج وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا
عَلَیْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَیْظِ ط قُلْ مُوْتُوْا بِغَیْظِكُمْ اِنَّ
اللّٰهَ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ○ (اے ایمان والو نہ بناؤ
بھیدی کسی کو اپنوں کے سوا وہ کمی نہیں کرتے تمہاری خرابی میں انکی
خوشی ہے تم جسقدر تکلیف میں رہو نکلی پڑتی ہے دشمنی ان کی زبان سے
اور جو کچھ مخفی ہے اُنکے جی میں وہ اس سے بہت زیادہ ہے ہم نے بتادئے
تمکو پتے اگر تم کو عقل ہے، سن لو تم لوگ اُنکے دوست ہو اور وہ تمہارے
دوست نہیں اور تم سب کتابوں کو مانتے ہو اور جب تم سے ملتے ہیں

کہتے ہیں ہم مسلمان ہیں اور جب اکیلے ہوتے ہیں تو کاٹ کاٹ
کھاتے ہیں تم پر انگلیاں غصہ سے تو کہہ مرو تم اپنے غصہ میں اللہ کو
خوب معلوم ہیں دلوں کی باتیں) (پارہ ۴ رکوع ۴)

ان آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے یہاں صاف
صاف آگاہ کر دیا کہ مسلمان اپنے اسلامی بھائیوں کے سوا کسی
کو بھیدی اور رازدار نہ بنائیں، کیونکہ یہود ہوں یا نصاریٰ
منافقین ہوں یا مشرکین' ان میں کوئی جماعت تمہاری حقیقی
خیرخواہ نہیں، بلکہ ہمیشہ یہ لوگ اس کوشش میں رہتے ہیں
کہ تمہیں پاگل بنا کر نقصان پہنچائیں اور دینی وُدنیوی خرابیوں
میں مبتلا کریں، ان کی خوشی اسی میں ہے کہ تم تکلیف میں
رہو اور کسی نہ کسی تدبیر سے تم کو دینی یا دنیوی ضرر پہنچ جائے،
جو دشمنی اور بُغض انکے دلوں میں ہے وہ تو بہت ہی زیادہ ہے
لیکن بسا اوقات عداوت وغیظ کے جذبات سے مغلوب ہو کر
کھلم کھلا ایسی باتیں کر گذرتے ہیں جو اُنکی گہری دشمنی کا صاف
پتہ دیتی ہیں، مارے دشمنی اور حسد کے انکی زبان قابو میں نہیں
رہتی، پس عقلمند آدمی کا کام نہیں کہ ایسے خبیث باطن دشمنوں
کو اپنا رازدار بنائے، خدا تعالیٰ نے دوست دشمن کے پتے اور

دوستی وغیرہ کے احکام کھولکر بتلا دئے ہیں جسمیں عقل ہو گی
ان سے کام لیگا یعنی یہ کیسی بے موقع بات ہے کہ تم ان کی
دوستی کا دم بھرتے ہو اور وہ تمہارے دوست نہیں بلکہ جڑ
کاٹنے والے دشمن ہیں اور طرفہ یہ ہے کہ تم تمام آسمانی کتابوں
کو ماننے ہو خواہ وہ کسی قوم کی ہوں اور کسی زمانہ میں کسی پیغمبر
پر نازل ہوئی ہوں جن کے خدا نے نام بتلا دئے ان پر تفصیل کے
ساتھ اور جنکے نام نہیں بتلائے ان پر بالاجمال ایمان رکھتے ہو
اسکے برخلاف یہ لوگ تمہاری کتاب اور پیغمبر کو نہیں مانتے،
بلکہ خود اپنی کتابوں پر بھی ان کا ایمان صحیح نہیں اس لحاظ سے
چاہئے تھا کہ وہ تم سے قدرے محبت کرتے اور تم ان سے سخت
نفرت کرتے اور بیزار رہتے مگر یہاں معاملہ برعکس ہو رہا ہے،
منافقین تو کہتے ہی تھے، عام یہود و نصاریٰ بھی بحث و گفتگو
میں "آمنا" (ہم مسلمان ہیں) کہہ کر یہ مطلب لے لیتے تھے کہ ہم
اپنی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں اور انکو تسلیم کرتے ہیں یعنی
اسلام کا عروج اور مسلمانوں کی باہمی الفت و محبت دیکھ کر یہ
لوگ جلے مرتے ہیں اور چونکہ اسکے خلاف کچھ بس نہیں چلتا اسلئے
فرطِ غیظ و غضب سے دانت پیستے اور اپنی انگلیاں کاٹ کاٹ

کھاتے ہیں یعنی خدا تعالیٰ اسلام اور مسلمانوں کو اور زیادہ ترقیات وفتوحات عنایت فرمائیگا، تم غیظ کھا کھا کر مرتے رہو، اگر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤ گے تب بھی تمہاری آرزوئیں پوری نہ ہونگی خدا اسلام کو غالب اور سر بلند کر کے رہیگا اسلئے مسلمانوں کو ان شریروں کے باطنی حالات اور قلبی جذبات پر مطلع کر دیا اور سزا بھی ان کو ایسی دے گا جو اندرونی شرارتوں اور خفیہ عداوتوں کے مناسب ہو، قرآنِ کریم سے آپ کے عہدِ مبارک میں ایسی جماعت کا بھی پتہ چلتا ہے جو سرے سے خدا ہی کی منکر تھی ان کے متعلق کسی رسول اور کسی کتاب کے ماننے کا سوال ہی کیا پیدا ہو سکتا ہے، اس فریق کا تذکرہ آیتِ ذیل میں کیا گیا ہے: مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ ط (اور کچھ نہیں بس یہی ہے ہمارا جینا دنیا کا ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہم جو مرتے ہیں سو زمانہ سے) (پارہ ۲۵ رکوع ۱۹)

اس جماعت کا وجود اُسوقت گو قلیل تھا اور بے علمی کی وجہ سے اسکو فلسفیانہ رنگ بھی نہیں دیا گیا تھا لیکن زمانہ کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ یہ جماعت بھی ترقی کرتی رہی اور عالمِ مادیات کی تحقیقات نے اسکو اتنا پھیلا دیا کہ اب وہ

ملک کے گوشہ گوشہ میں قلیل یا کثیر تعداد میں نظر آنے لگے اور علوم وفنون نے اسکو ایسا رنگ دیا کہ بڑی بڑی جماعتوں نے اِس عالم کو جسکے ذرہ ذرہ سے حکمت و اسرار اسکے علیم وخبیر خالق کا پتہ دے رہے تھے اُسکا انکار کر کے ان سب کو براہ راست ایک غیر ذی شعور مادہ کے سپرد کر دیا اور شدہ شدہ اسکے اثرات بدقسمتی سے مسلمانوں کے اندر بھی نمایاں ہونے لگے اور یہ فرق ہماری نظروں سے بھی اوجھل ہو گیا کہ قدرت کس کا نام ہے اور فطرت کس کا نام ہے انہوں نے عالم بے شعوری میں ان دونوں کے اصول و فروع کی رعایت کئے بغیر انکو مرادف الفاظ تصور کر لیا حتیٰ کہ مسلمانوں میں بعض تعلیم یافتہ دماغ بھی عالم کے انقلاب کا رشتہ خدا تعالیٰ کی قاہرانہ طاقت کے بجائے مادی اسباب سے اس طرح قائم کرتے ہیں گویا یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس جہان کا کوئی خالق ہے ہی نہیں حالانکہ عالم پر اور اسکے نظام میں باہمی ربط پر ایک سرسری نظر ڈالئے جو بات سب سے پہلے بدیہی ہو کر سامنے آتی ہے وہ یہی ہے کہ اسکا پیدا کرنیوالا نہ صرف علیم وقدیر ہے بلکہ حکیم بھی ہے لیکن انسانی دماغ کی ساخت بھی عجیب ہے، کہ وہ جس جانب ڈھل جاتی ہے بس اُسی جانب کے دلائل تیار کرنے میں

مصروف ہو جاتی ہے اور دوسری جانب کی طرف اسکا خیال
بھی منتقل نہیں ہوتا ایسے نادان انسانوں کو انسانوں میں
شمار کرنا بھی مشکل ہے، ہماری موجودہ دنیا میں اب ایسے افراد
کی اتنی کثرت ہوتی جاتی ہے کہ جو اُنکا مخالف ہو اس کا شمار
قدامت پرست اور بے عقلوں میں ہونے لگتا ہے لیکن جب
کفار کی صف میں اہل کتاب اور غیر اہلِ کتاب کا فرق اسلامی
نقطۂ نظر سے ملحوظ رکھا گیا ہے تو یہ ظاہر ہے کہ ان منکرین کا
شمار کس قطار میں ہو سکتا ہے ہمارے زمانہ میں بڑی دشواری
یہ ہے کہ ایک طرف اسلام ہے اور وہ بھی ضعیف شکل میں،
دوسری طرف کفر اپنی مختلف شکلوں میں اُمڈا چلا آرہا ہے
اور وہ بھی پوری شان و شوکت کے ساتھ اسلئے ضعیفوں کو
اپنی معیشت کا توازن قائم رکھنے کیلئے طاقتور جماعتوں کا سہارا
تلاش کرنا پڑتا ہے، یہ موقع نہایت نازک اور عمیق غور و فکر کا
محتاج ہے، یہاں عقلِ کوتاہ اندیش خدا نہ کردہ اگر قادرِ مطلق کی
طاقت سے ذرا غفلت کر جائے تو اسکو صحیح فیصلہ کرنا بہت دشوار
ہو جاتا ہے وہ صرف اپنے مقصد کی کامیابی کے سوچنے میں اتنی
مستغرق ہو جاتی ہے کہ دوسرے اطراف و جوانب کا استحضار

اسکو نہیں رہتا اور بسا اوقات اپنی نفع کی خاطر وہ ان مضرتوں
کو بھول جاتی ہے جو اس تھوڑے نفع کے ساتھ لازمی طور پر
اسکو بھگتنے پڑتے ہیں، انسان کتنا ہی دانا ہو لیکن پھر اس کی
عقل قاصر ہے اسلئے ایک مسلمان کیلئے لازم ہے کہ وہ کسی آخری
فیصلہ تکمیل کرنے سے پہلے کم ازکم ایک نظر اپنے دین سماوی
کی طرف بھی کرلے جس نے اپنے متعلق انسانی معاش اور معاد
کے لئے ایک مکمل آئین ہونیکا دعویٰ کیا ہے اس نے ایک اصول
ہمکو یہ بھی بتلایا ہے کہ عالم کی ہر چیز میں نفع بھی ہے نقصان
بھی اسلئے اشیاء کا صرف نفع ہی نہیں دیکھنا چاہیئے بلکہ یہ دیکھنا
چاہیئے کہ اسمیں زیادہ نفع ہے یا نقصان اور فیصلہ اسکے بعد
کرنا چاہیئے لیکن انسان کی عجلت پسند طبیعت اسکو اس غور و فکر
کی مہلت نہیں دیتی اور اپنے نفع کی خاطر دوسری جانب کی
مضرت سے غافل ہو کر یک طرفہ فیصلہ کر ڈالتی ہے اور پھر کچھ
عرصہ کے بعد جب اسکے عواقب نظر آتے ہیں تو وہ اتنے خطرناک
ہوتے ہیں کہ معاملہ لاعلاج اور قابو سے باہر ہو جاتا ہے اسلئے
اگر دشمنوں میں سے کسی کیساتھ ساز کرنا ناگزیر ہو جائے تو فیصلہ جذبات سے
کرنا نہیں چاہیئے بلکہ نفع و مضرت کے توازن پر پورے غور و خوض کے بعد

فیصلہ کرنا چاہئیے اسلام نے کافروں کے ساتھ دوستی اور اعتماد کی اگرچہ بڑی اہمیت کیساتھ ممانعت کی ہے لیکن اپنی حدود میں رہ کر انکے ساتھ عہد و معاملات کرنے میں بڑی وسعت رکھی ہے اور انکی پابندی کرنا اولین فرض قرار دیا ہے کاش کہ مسلمان سب باہم متفق ہو کر ایک اسلامی رشتہ میں منسلک ہوجائیں اور یہ یقین محکم پیدا کرلیں کہ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ ط (اور مدد ہے صرف اللہ ہی کی طرف سے جو کہ زبردست ہے حکمت والا) (پارہ ۴ رکوع ۴) تو انہیں آج دنیا بھر میں کسی کا منہ تکنا نہ پڑے اور نہ کسی کی خوشامد کی ضرورت باقی رہے لیکن باہم تفرقہ در تفرقہ پارٹی در پارٹی کا گلہ کس سے کیا جائے ؎

ہر کس کہ از دستِ غیر نالہ کند ؛ سعدیؒ از دستِ خویشتن فریاد

اس سے زیادہ اس مسئلہ کو میں اور صاف صاف الفاظ میں لکھنا پسند نہیں کرتا، امید ہے کہ غور کرنے والوں کے لئے یہ مجمل کلمات کافی ہوں گے۔

نام نہاد اور غلط عالموں کا برسرِ اقتدار آنا اسلام کی بنیادیں ہلا دیتا ہے

(۳۸) وَعَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍوؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ

عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَقْبِضُ الْعِلْمَ اِنْتِزَاعًا یَّنْتَزِعُہٗ مِنَ الْعِبَادِ وَلٰکِنْ یَّقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَآءِ حَتّٰی اِذَا لَمْ یُبْقِ عَالِمًا اِتَّخَذَ النَّاسُ رُؤُسًا جُهَّالًا فَسُئِلُوْا فَاَفْتَوْا بِغَیْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوْا وَاَضَلُّوْا۔ متفق علیہ مشکوٰۃ صفہ ۳۳

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ علم کو یوں ہی نہیں اٹھائیگا کہ اپنے بندوں کے سینوں سے چھین لے بلکہ اسکی صورت یہ ہوگی کہ علماء کو ایک ایک کر کے اٹھاتا رہیگا، یہاں تک کہ جب ایک عالم بھی باقی نہ رہیگا تو لوگ جاہلوں کو عالموں کے بجائے اپنا سردار بنالینگے وہ بے علمی کے ساتھ فتویٰ دینگے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ خود تو گمراہ تھے ہی دوسروں کو بھی گمراہ کر دینگے۔

شرح: خدا تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ایک صفت علم ہے اور یہی انسانیت کا طرۂ امتیاز ہے بلکہ ایک منشار خلافتِ آدم علیہ السلام کا یہ بھی ہے، یہ حدیث خبردار کرتی ہے کہ ایک وقت وہ آئیگا کہ یہ عظیم نعمت انسانوں سے واپس لے لی جائیگی اور یہ وہ خطرناک دور ہوگا جبکہ انسانیت کا گویا خاتمہ قریب ہوگا اور خلافتِ ارضی فنا ہونیوالی ہوگی۔ اس نعمت کے اٹھنے کے اسباب بھی حدیثوں میں مذکور ہیں اور وہ علماء کی جانب سے انکے قلوب

میں دنیوی طمع کا پیدا ہونا اور مخلوق کی جانب سے انکی ناقدری
اور اس سے بے نیازی ہوگی، یہاں ایک تیسری بات کا ذکر ہے
کہ اس عظیم نعمت کے اٹھنے کی صورت کیا ہوگی یعنی یہ کہ جو صحیح علماء
ہونگے وہ اٹھتے چلے جائینگے اور جو انکے جانشین ہونگے وہ نام کے
علماء ہونگے انکے سینے صحیح علم سے خالی ہونگے یعنی علمِ نبوت اور
خشیتِ الٰہی، اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ عام گمراہی پھیل جائیگی اور جسطرح
کہ علم ہی کے ذریعہ خلافتِ ارضی قائم ہوئی تھی اسی طرح اسکے
خاتمہ سے وہ ختم بھی ہو جائے گی، ہمارا مقصد یہاں علم سائنس کی
تعلیم سے روکنا نہیں بلکہ ہمکو اسکی آج بہت ضرورت ہی لیکن
وہ سب کو معلوم ہے اسلئے جس بات پر زور دینا ہے وہ یہ ہے
کہ کہیں اس شوق میں اصل علم فنا نہ ہو جائے، یہ بات یاد رکھنی
چاہیئے کہ اگر صحیح علماء جدید فنون سیکھ لیں تو وہ جدید فنون کا
استعمال اسطرح کرینگے کہ ان فنون کا فائدہ بھی حاصل ہوگا
اور صحیح علم بھی اپنے مرکز سے ہٹنے نہ پائے گا لیکن اگر جدید سائنسداں
دو چار کتابیں پڑھ کر علماء کی فہرست میں داخل ہو گئے تو پھر یہ
ہو کر رہیگا کہ دانستہ یا نادانستہ وہ علم صحیح کو سائنس کی جدید
روشنی میں مطالعہ کرینگے جسکے بعد صحیح علم کا اپنے مرکز سے ہٹنا

لازم ہوگا اسلئے آپ کو یہ فیصلہ کر لینا لازم ہے کہ آپ کو علمِ نبوت درکار ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کیا آپکے نزدیک آئے دن سائنس کی تبدیلیوں سے وہ بھی قابلِ تبدیل ہونا چاہیئے یا نہیں، جدید تعلیم کی بدولت جو دیندار طبقہ میں نئے سمی اثرات پیدا ہوگئے وہ علامہ اقبال کے ان اشعار میں پڑھ لیجئے ؎

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی ۔۔۔ فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی
یعنی وہ صاحبِ اوصافِ حجازی نہ رہے ۔۔۔ مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے

یہ تو انکے زمانہ کا نقشہ تھا اب اندازہ فرما لیجئے کہ اتنے عرصہ کے بعد اب دین کا نقشہ کیا ہو گیا ہوگا، یہی وجہ ہے کہ ابنِ سیرین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے صحیح مسلم میں منقول ہے: اِنَّ هٰذَا الْعِلْمَ دِيْنٌ فَانْظُرُوْا عَمَّنْ تَأْخُذُوْنَ دِيْنَكُمْ ۔ مشکوٰۃ صفحہ ۳۷

یعنی یہ علم نبوت تمہارا دین ہے اسلئے جب اپنا دین حاصل کرو ذرا اچھی طرح دیکھ بھال کر لینا کہ جس سے تم دین حاصل کر رہے ہو وہ کیسا شخص ہے (یعنی دیندار ہے یا بے دین)

کیا مسلمان یہ پسند کرینگے کہ قرآن پاک صرف اوراق میں اور اسلام صرف نام کا اسلام باقی رہجائے

(۳۹) عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ

عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یُوْشِكُ اَنْ یَّاْتِیَ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ لَّا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُهٗ وَلَا یَبْقٰی مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُهٗ مَسَاجِدُهُمْ عَامِرَةٌ وَّهِیَ خَرَابٌ مِّنَ الْهُدٰی عُلَمَآؤُهُمْ شَرُّ مَنْ تَحْتَ اَدِیْمِ السَّمَآءِ مِنْ عِنْدِهِمْ تَخْرُجُ الْفِتْنَةُ وَفِیْهِمْ تَعُوْدُ۔ رواہ البیہقی مشکوٰۃ صفہ ۳۸

ترجمہ: حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وہ خطرناک زمانہ قریب ہی آنیوالا ہے جبکہ اسلام کا صرف نام ہی باقی رہ جائیگا اور اسی طرح قرآن پاک کے بھی صرف نقوش باقی رہ جائینگے اسوقت اگر تم ان کی مسجدوں کو دیکھو گے تو وہ نمازیوں سے بھری ہوئی اور آباد نظر آئینگی اور ہدایت کا ان میں نام بھی نہ ہوگا اس لحاظ سے وہ سب برباد ہونگی، انکے علماء (دنیا طلب اور بے علم ہونگے) آسمان کے نیچے بسنے والوں میں سب سے بدتر ہوں گے اور ایسے فتنہ پرداز ہونگے کہ فتنے ان ہی میں سے اٹھینگے اور پھر لوٹکر ان ہی میں داخل ہونگے۔

شرح: قرآن کریم صدیوں تک مسلمانوں کیلئے صرف تلاوت کرنیکی ایک کتاب نہ تھی بلکہ انکی سیاسی اور مذہبی زندگی کا ایک مکمل دستور العمل بھی یہی ایک کتاب تھی۔ جزیرۂ عرب سے

نکلکر جب اسلام باہر نکلا اور قیصر و کسریٰ جیسی بڑی بڑی
سلطنتیں اسلام کے زیرِ حکومت آئیں تو اس وقت مسلمانوں
کی راہ نما بھی یہی کتاب تھی، حضرت عثمان غنی رض کے زمانہ میں
جب چار دانگ عالم میں اسلام کا پرچم لہرا رہا تھا تو اسکی بنیاد
بھی یہی کتاب اللہ تھی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ جملہ مفتوح اقوام
صرف ایک جنگلی بدّو نہ تھیں بلکہ اپنے ممالک کے لئے کچھ منظّم
ضوابط و آئین بھی رکھتی تھیں، عمرانیات و صنائع اور ملکی ترقیات
جتنی انکے زمانہ میں تھیں موجودہ زمانہ کی ترقیات کے لحاظ سے
بھی وہ کچھ کم نہ تھیں، یہ دوسری بات ہے کہ جدید ضروریات
نے ہمارے دماغوں کو کچھ جدید ایجادات کی طرف متوجہ کر دیا
ہے جنکی اُس وقت ضرورت محسوس نہیں کی جاتی تھی اور یہ
زمانہ کے ارتقاء کا طبعی تقاضا ہے لہٰذا اس کا انکار نہیں
کیا جا سکتا لیکن یہ سمجھنا خلافِ واقع ہے کہ قرآنی حکومت
صرف اس دور میں کامیاب تھی جبتک کہ دماغوں میں کسی قسم
کی علمی روشنی موجود نہ تھی گذشتہ دور کی ترقیات اور دماغی
قابلیتوں کا اندازہ یادگارِ قدیمہ اور غارہائے الورا کے مشاہدات
سے کیا جا سکتا ہے اور آگرہ کا تاج محل تو آج کی بات ہے

کیا ان زمانوں میں قرآنی قوانین بالکل معطل اور بیکار ثابت ہو چکے تھے؟ لیکن آج اسکی ناکامیابی کا تخیل جن اسباب کی بنا پر ہے وہ بہت تفصیل طلب ہیں جسکا یہ محل نہیں، افسوس ہے کہ اس دستور العمل پر عمل کئے بغیر بلکہ اسکو سمجھے بغیر جب پہلے سے پہلے ہی یہ فیصلہ کر ڈالا جائے کہ قرآنی تعلیمات ہماری ترقیات کا ساتھ نہیں دے سکتیں تو یہ وہی زمانہ ہے جسکی اس حدیث میں پیشین گوئی کی گئی ہے اور جب ہماری زندگی کے گوشہ گوشہ سے قرآنی دستور نکل جائے اور اس پر کہیں عمل باقی نہ رہے تو پھر یہ دن وہی دن ہے جسکا حدیث مذکور میں بہ ایں الفاظ ذکر کیا گیا ہے کہ قرآنِ پاک کی حقیقت صرف اوراق میں مکتوب رہ جائیگی کیا جو کتاب خالقِ کائنات کی جانب سے افضل الرسل علیہ الصلوٰۃ والسلام پر افضل مَلَک کے ذریعہ سے زندگی کا ایک دائمی دستور العمل بنکر لوح محفوظ سے نازل کی گئی تھی آج مسلمان اسکو صرف اِس حیثیت میں دیکھنے پر راضی ہیں کہ وہ صرف اوراق میں لکھی ہوئی رہ جائے؟

اب آپ سنئے کہ اسلام کیا چیز ہے؟ اسلام کا اگرچہ اجمالی عنوان صرف کلمہ طیبہ ہے لیکن اسکی تشریح میں وہ تمام تفصیلی دفعات

بھی شامل ہیں جو قرآنی ضابطہ کے ماتحت صحابہ وتابعین و
تبع تابعین رحؒ کے عہد میں احادیثِ نبویہ کی روشنی میں ان لوگوں
نے مدوّن کی تھیں جنہوں نے دورِ اوّل کے دینی ماحول
میں در در پھر کر مختلف اربابِ علم سے انکو حاصِل کیا تھا،
یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ دین ہو یا دنیا ہر ایک کے لئے ایک
ماحول کی ضرورت ہے جسطرح کہ ہر درخت کے پھلنے پھولنے
کیلئے ایک خاص قسم کی زمین اور ایک خاص آب وہوا کی ضرورت
ہوتی ہے، ایک ہی درخت اپنے موافق زمین اور اپنے مناسب
آب وہوا میں جتنی آسانی کے ساتھ پرورش پاتا اور پھول وپھل
لے آتا ہے وہی درخت دوسری جگہ بڑی جد وجہد کے بعد بھی
وہ نشو ونما حاصِل نہیں کرسکتا اسی طرح اسلام جب عجم میں پھیلا
اور مختلف قسم کے مذاہب اور مختلف قسم کے عقائد اور مختلف
مزاجوں کے لوگوں سے اسکو سابقہ پڑا تو ماحول کی اس ناسازگاری
سے جو نشو ونما اسکو اپنے پہلے سازگار ماحول میں حاصِل تھی اب
وہ حاصل نہ رہی اور اب تو آراء کا اختلاف اس درجہ ناگفتہ بہ
حالت پر جا پہنچا ہے کہ ایک جماعت نے تو اسلامی تشریحات
ہی سے صاف انکار کر ڈالا حالانکہ وہ اُس دور میں مرتب ہوئی

تھیں جسمیں کہ احادیثِ نبویہ کی روشنی اور صحابہ اور تابعین کے فتاویٰ کی موجودگی سے اسلام کی تدوین ہوئی تھی لیکن جن لوگوں کو زبانِ عربی پر بھی عبور حاصل نہ تھا اس پر جو ماحول ان کو نصیب ہوا وہ کفر کی طاقت کا ماحول تھا، ان حالات میں انہوں نے اس دور کی مرتب کردہ کاوشوں کا نام صرف چند اشخاص کی رائے رکھ کر اسکو ردّی کی طرح پھینک دیا حالانکہ وہ متأخرین کیلئے بہت بڑا قیمتی ذخیرہ تھا، آج بھی دنیا میں کسی ضابطہ کی تشریحات میں بڑے بڑے ججوں کے فیصلوں کی بڑی قیمت سمجھی جاتی ہے لیکن بدقسمتی سے مسلمانوں کی ایک جماعت نے اس سے صرف انکار ہی نہیں کیا بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھکر براہِ راست خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے بھی انکار کر دینا اسلام کا ایک مسلّمہ اصول قرار دے ڈالا، اب ظاہر ہے کہ جب احادیث نبویہ ہی کی کوئی قیمت نہ رہی "العیاذ باللہ" تو اسلام کے ججوں کی تشریحات کی کیا وقعت باقی رہ سکتی تھی، اسلئے بہت سے لوگوں کے سامنے اب ایک صرف قرآن رہ گیا جو کہ عربی زبان میں نازل ہوا تھا اور وہ بھی فصاحت اور بلاغت کے اس اعلیٰ درجہ میں جسکا نام اِعجاز ہے اسکو ان لوگوں نے

بڑے ادب اور احترام کیساتھ (بزعمِ خود) اُردو یا انگریزی تراجم سے انسانی دماغی بنائی ہوئی سائنس کی روشنی میں مطالعہ کرنا شروع کیا اور وہ بھی ایسے ماحول میں جو اسلام کا ہمنوا تو درکنار موجودہ زمانہ میں اسکے ناقابلِ عمل ہونے کا یقین رکھ چکا ہے پھر اسکی اسلام پرستی کا یہ ایک احسان ہی کہئے کہ اپنے اس مطالعہ سے جو قرآنی ضابطہ کی تشریح اسکے مغرب زدہ دماغ میں آگئی اس نے اسکا نام اسلام رکھ دیا اور اب اس جدید مجوزہ اسلام میں اتنی لچک اور وسعت پیدا ہوگئی کہ اگر اسمیں نبوت کا اختلاف بھی پیدا ہو جائے تو پھر بھی وہ اسلام میں قابلِ برداشت ہو سکتا ہے والعیاذ باللہ

خلاصہ یہ ہے کہ اب اسلام کا مفہوم ایک ایسا مفہوم بنالیا گیا ہے جو صرف کلمۂ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کے وسیع سے وسیع دائرے میں داخل رہنے سے باقی رہ سکتا ہے اگرچہ اسمیں اسکے بنیادی اصولوں میں سے کتنے ہی اصول کا انکار کر ڈالا جائے اب اگر انکو اسپر تنبیہ کیجاتی ہے تو اسکا نام فرقہ پرستی اور تنگ نظری رکھا جاتا ہے اسکو حدیثِ مذکور کے الفاظ میں یوں ادا کیا گیا ہے کہ ایک زمانہ ایسا آئیگا جبکہ اسلام کا نام ہی نام باقی رہجائیگا

اور اسکی حقیقت اور اسکی روح یکسر فنا ہو جائیگی، کیا آپ ایسے اسلام کو پسند کرتے ہیں؟

حدیث کا تیسرا فقرہ بہت عبرتناک ہے اور اتنا ہی تعجب خیز بھی ہے یعنی یہ کہ اسلامی دور اس دورِ تنزل کا نقشہ اس طرح نہیں بدلیگا کہ قرآن پاک ظاہری طور پر مسلمانوں کے ہاتھوں میں نہ رہے یا خدانہ کردہ وہ کھلم کھلا اسلام سے بیزاری کا اظہار کردیں اسکا نام تنزل نہیں یہ تو کھلا ارتداد ہے بلکہ یوں ہوگا کہ ظاہری رونق پہلے سے زیادہ ہوگی اور اسلام کا دعویٰ پہلے سے زیادہ طمطراق کے ساتھ ہوگا، ذرا نگاہِ عبرت سے دیکھئے کہ کیا قرآن پاک کبھی اس آب وتاب سے چھپا کرتے تھے اور کیا کبھی غلغلۂ اسلام گلی اور کوچوں میں اس بلند آہنگی سے مچا کرتا تھا، اسی طرح حدیث کے تیسرے جملے میں یہ ہے کہ یہ تنزل اس طرح پیش نہیں آئیگا کہ مسجدوں کی تعمیر بند ہو جائے یا اسمیں نمازی نظر نہ آئیں بلکہ مساجد پہلے سے زیادہ رونق دار بنائی جائینگی، نمازی بھی اسمیں پہلے سے زیادہ نظر آئیں گے مگر یہ سب کچھ فخر ومباہات کیلئے ہوگا، ہدایت کی روح ان میں گم ہوگی اور اس سب کی بنیاد یہ ہوگی کہ اس وقت جو انکے علما ہونگے

کہ مخلوق میں اسوقت آسمان کے نیچے سب سے بدتر جماعت یہی ہوگی اور جب علماء کا حال اتنا ابتر ہو جائے گا تو پھر روح ہدایت کہاں سے آئے۔

یہاں جس طرح اسلام کے دورِ انحطاط کی داستان ہے اسی طرح علماء کے دورِ انحطاط کا نوحہ بھی مذکور ہے جن کو اسلامی نقطۂ نظر سے علماء کہنا بھی غلط ہے وہ صرف نام کے علماء ہونگے میں یہاں قدیم تاریخ کا تذکرہ کرنا نہیں چاہتا ابھی قریب ہی زمانہ میں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور انکا خاندان مثلاً حضرت شاہ اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ اور حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ مہاجر مکی اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اور ہمارے زمانہ کے حضرت شیخ الہند اور شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحؒ اور انکے بعد بھی بہت سے علماء ربانیین ایسے رہے ہیں جنکی تاریخ ابھی تک زندہ ہے اور وہ یہ شہادت دے سکتی ہے کہ اس طبقہ کو اسلام کی سربلندی کے سوا دنیوی مقاصد اور اقتدار سے ذرہ برابر بھی کوئی علاقہ نہ تھا، ان حضرات نے جہاد کئے اور اپنے وطن چھوڑے حتیٰ کہ بعض نے شہادت کے جام بھی

ذوق وشوق کے ساتھ نوش کئے اور آئندہ علماء کے لئے اپنی زندگی کے یہی سبق چھوڑ گئے اسلئے علی الاطلاق علماء سے بدگمانی کر کے علماء حق کو بھی نظر انداز کر ڈالنا اور اسکے برخلاف ایسی کوشش کرنی کہ جسکے نتیجہ میں ایسے علماء پیدا ہی نہ ہوں جن میں صحیح اسلامی روح ہو اور صحیح اختلافِ رائے کرنیکی ہمت بھی ہو، اسلامی آئین کو زندہ کرنے کے بجائے ہمیشہ کے لئے اس کو دفن کرنے کے مُرادف ہوگا۔

عالمِ نساء کی اہمیت کے باوجود اسکی بعض قدرتی اور اصولی خامیاں

(۴۰) عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ رضی قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ اَضْحٰی اَوْفِطْرٍ اِلَی الْمُصَلّٰی فَمَرَّ عَلَی النِّسَآءِ فَقَالَ یَا مَعْشَرَ النِّسَآءِ تَصَدَّقْنَ فَاِنِّیْ اُرِیْتُکُنَّ اَکْثَرَ اَھْلِ النَّارِ فَقُلْنَ وَبِمَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ قَالَ تُکْثِرْنَ اللَّعْنَ وَتَکْفُرْنَ الْعَشِیْرَ مَا رَاَیْتُ مِنْ نَّاقِصَاتِ عَقْلٍ وَّدِیْنٍ اَذْھَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الْحَازِمِ مِنْ اِحْدٰکُنَّ قُلْنَ وَمَا نُقْصَانُ دِیْنِنَا وَعَقْلِنَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ

قَالَ اَلَیْسَ شَہَادَۃُ الْمَرْأَۃِ مِثْلَ نِصْفِ شَہَادَۃِ الرَّجُلِ قُلْنَ بَلٰی قَالَ فَذٰلِکَ مِنْ نُقْصَانِ عَقْلِہَا اَلَیْسَ اِذَا حَاضَتْ لَمْ تُصَلِّ وَلَمْ تَصُمْ قُلْنَ بَلٰی قَالَ فَذٰلِکَ مِنْ نُقْصَانِ دِیْنِہَا۔ رواہ البخاری فی باب ترک الحائض الصوم صفہ ۴۴

ورواہ فی کتاب الایمان عن ابن عباسؓ مرفوعًا وفیہ قَالَ یَکْفُرْنَ الْعَشِیْرَ وَیَکْفُرْنَ الْاِحْسَانَ لَوْ اَحْسَنْتَ اِلٰی اِحْدَاہُنَّ الدَّہْرَ ثُمَّ رَأَتْ مِنْکَ شَیْئًا قَالَتْ مَا رَأَیْتُ مِنْکَ خَیْرًا قَطُّ

ترجمہ: ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عیدِ قرباں یا عید الفطر میں عیدگاہ کی طرف تشریف لائے (اُسوقت عیدین کی نماز وں میں عورتیں بھی شریک ہوتی تھیں) آپ کا عورتوں کی صفوں کیطرف گذر ہوا تو آپ نے ان کو صدقہ کرنیکے لئے رغبت دلائی اور فرمایا کہ صدقہ کرو کیونکہ مجھکو جہنم کا نظارہ دکھلایا گیا تو اسمیں زیادہ تر تم ہی کو دیکھا ہے انہوں نے عرض کی یارسول اللہ ہمارے کس قصور پر؟ آپ نے فرمایا اس پر کہ تم بات بات پر لعنت کرنے کی عادی ہو اور اپنے شوہر کی بڑی ناشکری کرتی ہو میں نے نہیں دیکھا جو دین عقل میں ناقص ہو پھر ایک سمجھدار پختہ کار شخص کی عقل پر پردہ ڈالنے والی تم سے

بڑھ کر کوئی اور ہو سکتا ہو اس پر انہوں نے عرض کی کہ یارسول اللہ ہمارے دین اور عقل میں خامی کیا ہے ذرا تشریح فرما دیجئے۔ آپ نے فرمایا کیا یہ بات نہیں ہے کہ ایک عورت کی شہادت مرد کی نصف شہادت کے برابر ہوتی ہے (یعنی دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کی شہادت کے قائم مقام ہے) انہوں نے عرض کی یارسول اللہ یہ تو ضرور ہے آپ نے فرمایا یہ اسی وجہ سے تو ہے کہ تم میں عقل کا کچھ نقصان ہے، اب رہا تمہارے دین کا نقصان تو کیا یہ بات نہیں کہ تم جب اپنے خاص ایام میں ہوتی ہو تو نہ تم روزہ رکھ سکتی ہو اور نہ نماز پڑھ سکتی ہو، انہوں نے عرض کی یارسول اللہ یہ بھی ہے، آپ نے فرمایا یہی تو تمہارے دین کے ناقص ہونیکا ثبوت ہے، بخاری شریف کی دوسری روایت میں شوہر کی ناشکری کی تفصیل یہ ہے کہ اگر شوہر تمام عمر بھی تمہارے ساتھ احسان کرتا رہے پھر کہیں اتفاق سے کسی بات میں بال برابر اس سے ذرا کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو پٹ سے بول اٹھو گی کہ ہمارے ساتھ تو عمر بھر تم نے کبھی احسان کیا ہی نہیں۔

شرح: اس سے قبل کہ میں حدیث میں صنفِ نساء کی فطری خامیاں ذکر کروں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس امر کا اعلان کر دوں کہ شریعتِ اسلام نے ایسے وقت میں عورت کے حقوق کا تعارف کرایا ہے جبکہ عورت کا وجود دنیا میں ناقابلِ برداشت

سمجھا جاتا تھا حتیٰ کہ ایک مشفق باپ اپنی دختری اولاد کو اپنے
ہاتھوں سے دفن کر دینا اپنا ایک فرض سمجھتا تھا تو پھر اگر وہی
شریعت عورت کی فطری خامیوں کا کوئی تذکرہ کرتی ہے تو
پھر اس پر یہ حکم لگا دینا کہ اسلام میں عورت کا کوئی حق نہیں
سمجھا گیا بہت بڑی غلطی ہوگی، میرا یہ عقیدہ ہے کہ عورت کا
وجود زندگی کے لئے ایک حیثیت سے اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے
جتنا کہ مرد کا، میں جانتا ہوں کہ حضرت آدم علیہ السلام مسجودِ ملائکہ
بنے، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ خلافتِ ارضی کا تاج ان کے سر پر
رکھا گیا مگر اسی کے ساتھ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ انکا خانۂ دل
اسوقت تک ویران پڑا رہا جب تک کہ حضرت حوّا کا وجود ظہور پذیر
نہ ہوا اسلئے جب آدم علیہ السّلام ہی کا خانۂ دل عورت کے بغیر
ویرانہ رہا تو نسلِ انسانی میں وہ کونسا خانہ ہو گا جو عورت کے
بغیر آباد ہو سکتا ہو، مَیں جانتا ہوں کہ حضرت آدم علیہ السلام بڑے
بڑے کمالات کے حامل تھے مگر اسی کے ساتھ میں یہ بھی جانتا
ہوں کہ وہ اپنی وحشت دُور کرنیکے لئے پھر کسی کی رفاقت کے
پیاسے تھے اور جب تک حضرت حوّا کی پیدائش نہ ہوئی اس
وقت تک انکی یہ پیاس نہ بُجھ سکی اور انکا خانۂ ویراں آباد

نہ ہو سکا، اسی کی طرف قرآن مجید میں اشارہ فرمایا ہے:
وَجَعَلَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا لِيَسۡكُنَ اِلَيۡهَا (اور اسی سے بنایا
اس کا جوڑا تاکہ اسکے پاس آرام پکڑے) (پارہ ۹ رکوع ۱۴)

اگر عورت کے بغیر مرد کو قلبی سکون حاصل ہو سکتا تو
کیا قدرتِ الٰہیہ آدمؑ کے لئے ایک دوسرا مرد اُن جیسا پیدا نہ
کر سکتی تھی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا، اس سے معلوم ہوتا ہے
کہ آدمؑ کے لئے بھی ایک انیسۂ حیات کے سوا چارۂ کار نہ تھا اور
چونکہ اصلِ انسانی کے خصائص نسلِ انسانی میں نمودار ہونے
ضروری ہیں اسلئے پھر یہ صفت اُنکی نسل میں ہمیشہ کے لئے موجود رہی
کہ ہر مرد خواہ وہ کتنا ہی کامل کیوں نہ ہو لیکن اپنی زندگی کی تکمیل
کے لئے اور اپنے قلبی سکون و راحت حاصل کرنیکے لئے پھر عورت
ہی کا محتاج رہا، یہ نظریہ آج بھی مسلم ہے اور اسی نظریہ کے
ماتحت شریعت نے نکاح کو مسنون فرمایا ہے کیونکہ بلا نکاح کے
مرد کی زندگی کی تکمیل اور اسکے قلب کو سکون حاصل ہونا کیسے
ممکن تھا جبکہ اسکی اصل میں یہی صفت موجود تھی، افسوس ہو کہ
دنیا نے آج اس نظریہ کو تسلیم کیا مگر جو راستہ شریعت نے تجویز
کیا تھا اسکو بدل کر ایک غلط راستہ اختیار کر لیا یعنی آج بھی

متمدّن ممالک میں عورت کی عظمت اس پر موقوف ہے کہ اسکے
چند دوست غیر مرد بھی ہوں اسی طرح کوئی مرد اسوقت تک
بلند پایہ شخصیت کا مالک نہیں سمجھا جاتا جب تک کہ اسکی رفاقت
کے لئے چند اجنبیہ عورتیں نہ ہوں حتیٰ کہ آج ہوائی جہاز میں یہ ایک
قانون ہے کہ اگر سب سیٹیں پُر ہوں تو کسی شخص کو یہ اختیار
حاصِل نہیں ہے کہ وہ اپنی انیسۂ حیات کو اپنی رفیقۂ سفر بھی
بنا سکے بلکہ یہ ضروری ہے کہ متبادل طریق پر ہر شخص کی رفیقۂ سفر
وہ ہو جو کسی دوسرے کی انیسۂ حیات ہو، کیا یہ رفاقت اسی لئے
نہیں کہ مرد کے لئے مرد کی ہم نشینی اتنا باعثِ سکون نہیں ہو سکتی
جتنا کہ عورت کی۔

پس نظریہ تو آج بھی وہی ہے لیکن طریقۂ کار اتنا مختلف
ہے کہ جو فطرت کا تقاضا تھا اسکو غیر شرعی طریق پر پورا کیا
جاتا ہے اسکے علاوہ آپ متمدن سے متمدن ممالک کا سفر کریں
تو آپ کو ہسپتال میں ہر جگہ نرس (NURSE) ہی ملیں گی آخر یہ
کیوں؟ کیا مرد اس خدمت کو انجام نہیں دے سکتے، پھر مریض
کی تیمارداری کیلئے عورت ہی کو کیوں مناسب سمجھا جاتا ہے،
اس قسم کی دوسری جزئیات سے آپ کو اسکا بھی کچھ اندازہ

ہوسکیگا کہ جدید دنیا میں عورت کچھ ایسے کمالات کی حامل ہے
جو مرد میں موجود ہی نہیں اور اسی طرح قدرت نے اسکے لئے کچھ
ایسے فرائض مقرر فرمائے ہیں جن کی ادائیگی مرد کے بس سے
باہر بات ہے۔

بلکہ میں ترقی کر کے اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ
عورت کا وجود دنیا میں نہ ہوتا تو آج دنیا کی آبادی ہی معدوم
ہوتی اور اگر اس موضوع پر میں زیادہ تفصیل کروں تو اسکے
لئے ایک رسالہ درکار ہے لیکن اگر عورت کے ان تمام کمالات
کے ساتھ قدرت نے اسمیں کچھ خامیاں بھی رکھی ہیں اور خود
صاحبِ شریعت نے ان کا اعلان کیا ہے انکا اظہار کردوں
تو اسکے یہ معنٰی نہیں کہ میں عورت کے کمالات کا قائل نہیں
اس لئے آپ یہ نہ کہیں کہ ؎

عیب ما جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

اسی کے ساتھ میں یہ دعوٰی بھی نہیں کرتا کہ مرد میں کسی جہت
سے کوئی نقصان نہیں، جہاں حقیقت یہ ہے کہ مرد ہو یا عورت
ہر ایک کو اپنی تکمیل کیلئے دوسرے کی ضرورت ہے لیکن سوال
حل طلب یہ ہے کہ کیا ہر ایک کیلئے میدان مشترک ہے یا علیٰحدہ

علیٰحدہ، اگر علیٰحدہ علیٰحدہ ہے تو مردوں کو عورتوں کے میدان
میں قدم ڈالنا یا عورتوں کو مردوں کے میدان کی طرف قدم
بڑھانا کیا یہ طریقۂ انصاف ہوگا؟ یہاں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ
اگر آپ نے عورتوں کے حقوق کے معنیٰ یہ سمجھے ہیں کہ مردوں
کے جو حقوق تھے ان سے چھین کر عورتوں کو دیدیئے جائیں
تو بیشک آپ نے ایک طرف عورتوں کی ہمّت افزائی کی
لیکن دوسری طرف مردوں کی حق تلفی کا بھی خیال رکھیئے،
جہاں آپکو اسکا لحاظ ضروری ہو کہ عورتوں کی زیادہ سے زیادہ قدردانی
کرنی چاہیئے اسی کیساتھ یہ خیال بھی لازم ہو پھر اس جدوجہد میں جنکی
قدردانی فطرتاً مسلّم تھی کہیں ان کی ناقدری نہ ہونے پائے۔
ابتک جو گفتگو تھی وہ نوعِ انسانی کی دو صنفوں کے
متعلق تھی اب آیئے ان کے افراد کا حل ذرا سا دیکھیے یعنی
یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو اپنی نعمتوں میں سے
جوڑا جوڑا عطا فرمایا ہے دو ہاتھ دیئے ہیں، دو پیر، دو آنکھیں،
دو کان اور ناک اگرچہ ایک ہے مگر اسمیں بھی دو سوراخ ہیں،
دہن بھی اگرچہ ایک نظر آتا ہے مگر اندر جا کر پھر اس میں دو نالیاں
ہیں، ان میں بھی بالعموم انسان کا دایاں جانب بائیں جانب سے

فطرۃً قوی تر ہے اور بایاں نسبتہً ضعیف، اسی طرح اگر شرف کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہاں بھی نظرِ شرعی میں دائیں جانب کو بائیں پر فوقیت حاصل ہے حتیٰ کہ ہر اشرف کام کے لئے دایاں ہاتھ اور پیر ہے اور دوسرے کمتر کاموں کے لئے بآیں جانب ہے لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس قدرتی تقسیم میں انسان نکے بائیں جانب کی کوئی حق تلفی کی گئی ہے یا اسمیں کچھ توہین ہے، نہیں نہیں وہ عین حکمت کے مطابق ہے حتیٰ کہ اگر کسی انسان کے بایاں بازو نہ ہو تو وہ بیکار سمجھا جاتا ہے اسی طرح اگر اسکے بایاں پیر نہ ہو تو وہ سیدھا کھڑے ہونے سے بھی قاصر ہو گا، بیلینس برابر رکھنے کیلئے یہاں دونوں کا وجود ایک سے زیادہ دوسرے کا ضروری ہے۔

اب اگر اس کو آپ سائنٹفک طریقہ پر سمجھنا چاہیں تو یوں سمجھئے کہ انسان کے نظامِ حیات کیلئے آکسیجن (OXYGEN) اور نٹروجین (NITROGEN) دونوں ضروری ہیں لیکن دونوں کے خواص جدا جدا ہیں حتیٰ کہ اگر ایک کے بجائے دوسرا استعمال کر لیا جائے یا اسمیں کچھ زیادتی پیدا ہو جائے تو انسانی حیات کا نظام درہم برہم بھی ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ جو خواص آکسیجن میں ہیں چونکہ وہ نٹروجین
میں نہیں اسلئے یہ اسکی توہین ہے اسی طرح اگر اسکے برعکس جو
خواص نٹروجین میں ہیں اگر وہ آکسیجن میں نہیں تو کیا اسکی
توہین ہے؟ یہی یہ بحث کہ کونسا جزو کتنا زیادہ ضروری ہے اسکا
جواب مختلف حالات پر مبنی ہے کہیں زیادہ آکسیجن دینا پڑتا
ہے اور کہیں زیادہ نٹروجین دینا پڑتا ہے۔

اب اس سے آگے چلکر عالم حیوانات پر نظر کیجئے تو قدرت
کا قانون وہاں بھی یہی نظر آتا ہے جو عالم انسان میں یعنی نر و
مادہ میں نر قوی ہوتا ہے اور مادہ ضعیف، پھر ہر ایک کی ذمہ داریاں
بٹی ہوئی ہیں اور یہاں بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ نر کے اوپر
اپنی مادہ کی بہت سی ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں جنکو وہ فطرتاً
ادا کرتا ہے۔

عالم حیوانات سے گذر کر اگر آپ عالم نباتات پر نظر ڈالیں
تو اسمیں بھی نر و مادہ کا وجود مسلّم ہے، عرب میں کھجور کے درخت
اسی طرح پپیتہ کے درخت میں اور اسی طرح دوسرے قسم کے نباتات
میں بھی نر و مادہ کا تنوع موجود ہے، اسمیں مادہ بار آور ہوتی ہے
اور نر بار آور نہیں ہوتا۔ اسکی شرح علم نباتات کے جاننے والے

اچھی طرح جانتے ہیں یہاں اسکی تفصیل مقصود نہیں۔ خدا تعالیٰ کا عام اعلان ہے: وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِيهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ۔ (اور ہر میوے کے رکھے اس میں جوڑے دو دو قسم کے) (پارہ ۱۳ رکوع ۷) اور اسی اصل کے ماتحت تخلیق کے ساتھ انکا جوڑا بنایا گیا ہے: خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا (اسی سے پیدا کیا اسکا جوڑا) (پارہ ۴ رکوع ۱۲) یہ بھی معلوم ہوگا ان میں اصل و فروع کی نسبت موجود ہے پھر مساوات کا سوال کیسا؟

اب زمین کو چھوڑ کر ذرا آسمان کی طرف نظر اٹھایئے تو وہاں بھی شمس و قمر اور مختلف قسم کے ستارے نظر آئینگے جن میں ہر ایک میں جسامت اور صفات کا اسی طرح بڑا اختلاف موجود ہے مگر یہاں بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا بلکہ سب کا وجود ہی عالم کے لئے یکساں ضروری سمجھا جاتا ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد اگر آپ صرف عورت کی جسمانی ساخت اور اسکی زندگی کے اطوار پر ہی گہری نظر ڈالیں تو پھر اسکا فیصلہ کرنا بہت آسان ہو جائیگا کہ کیا وہ ہر جگہ مردوں کے شانہ بشانہ چلنے کے لئے پیدا کی گئی ہے؟ کیا وہ حاکمیت یا مثلاً سپہ گری کے لئے موزوں ہے؟ یہ بحث کہ حاکمیت کے

شرائط کیا ہیں عنقریب آپکے سامنے آنیوالی ہے لیکن تعجب
اس پر ہے کہ جبکہ سپہ گری کے لئے مردوں میں بھی اتنے شرائط
درکار ہیں جن پر ہر مرد کا پورا اترنا مشکل ہے تو پھر عورت کو
مثلاً سپہ گری کے لئے کیسے موزوں خیال کیا جا سکتا ہے ؟
اور اگر انکی فوج بنا دی جائے تو کیا اسکا نام ترقی یا عورت کا
احترام رکھا جا سکتا ہے؟ ایک منصف اور فہیم شخص جب ہر
عورت کی زندگی، اوضاع و اطوار پر نظر ڈالتا ہے تو جو بات
پہلی نظر میں اسکے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ قدرت نے اسکو
انسانی نشو و نما کیلئے ایک "نازک گہوارہ" بنایا ہے، ایک مدت
دراز تک بحر ظلمات میں اسکی پرورش کرنا، اسکے بعد اپنے خون
کے قطرات اسکی غذا بنا دینا، اسکے بعد اپنی جان کو گھلا گھلا کر
اسکی غذا بنا دینا، اسکے بعد اسکی پاک و صاف تربیت کرنا اسکے
شرف کیلئے کیا کچھ کم ہے؟ مگر یہ فیصلہ آپ ہی کر لیجئے کہ ان حالات
میں کیا اسپر مردانہ ذمہ داریوں کا بار ڈالنا اسکی فطرت کے مناسب ہے؟
خوب یاد رکھئے! اگر آپ نے قدرت کے مقابلہ میں ایک
ضعیف صنف کو ترقی دیکر دوسری ترقی یافتہ صنف سے آگے
بڑھانا چاہا تو یہ ضعیف صنف بامِ ترقی پر پہنچے یا نہ پہنچے لیکن

اس کا نتیجہ ایک نہ ایک دن یہ نکلکر رہیگا کہ جو ترقی یافتہ صنف ہے وہ فطرتاً کمزور پڑتی چلی جائیگی، اسی طرح یہ بھی اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اگر آپ نے مردانی کرسی پر عورت کو بٹھایا تو اسکے نتیجہ میں ضرور عورت کی جگہ مرد کو بٹھایا جائیگا اور اسکے نظامِ عمل میں جو خلل واقع ہوگا اور ہو رہا ہے اس کا اندازہ آپ نہیں تو آپ کی نسلیں کر لیں گی۔

یہ تو اصلِ انسانی کی تصویر کا ایک رُخ تھا اب اسکا دوسرا رُخ ملاحظہ فرمائیے یعنی جسطرح آدمؑ کی خانہ آبادی کا ذریعہ حضرت حوّا بنیں اسی طرح اسلامی تاریخ ہمکو یہ بتاتی ہے کہ انکی خانہ بربادی میں بھی انکا کچھ حصہ تھا یعنی شیطان نے اپنی وسیلہ کاریوں کا آلہ بنانے کیلئے حضرت حوّاؑ ہی کو سب سے زیادہ موزوں سمجھا، حضرت حوّاؑ کیلئے فخر یہ نہیں کہ وہ خلیفہ بن جائیں اسکے لئے تو قدرت ہی نے اُنکا انتخاب نہیں کیا لیکن کیا یہ فخر انکے لئے کم ہے کہ وہ خلیفہ کے لئے اُنس وسکون کا واحد سامان قرار پائیں جسطرح یہ خامی اصلِ انسانی میں حضرت حوّا میں نمایاں ہوئی ضرور تھا کہ وہ انکی نسل میں بھی نمایاں ہو کر رہتی، چنانچہ تاریخ اسکی شاہد ہے کہ بہت سی

حکومتوں کی بربادی صرف صاحب مملکت کی انیسہ حیات کے ذریعہ ہوئی ہے۔
تقسیم ہند سے پہلے جب والسرائے مقرر ہوا کرتا تھا تو اس دور
میں بندگانِ اغراض اپنی مقصد برآری کیلئے میم صاحب ہی
کے گلے میں لاکھوں کے ہار ڈالا کرتے تھے اسکے بعد جب خوش قسمتی
سے آزادی نصیب ہوئی تو اس مسئلہ میں ہمارے نصیب نے ہمارا
ساتھ نہ دیا اور انگریز کی جاری کردہ رسم کی بنا پر دَورِ آزادی کے
بعد بھی اپنے اپنے مقاصد کیلئے میم صاحبہ ہی کو آلۂ کار بنانیکی
پالیسی قائم رہی اور کیا کیا عرض کیا جائے ہر قسم اور ہر عہد کی
مثالیں ذہن میں ہیں اس جگہ انکی تفصیل کرنی مصلحت نہیں ہے

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در مجلسِ رنداں خبرے نیست کہ نیست

میرے اس بیان کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ مردوں میں کچھ
نقائص نہیں، میرے عقیدہ میں وہ بھی ناقِص ہی ناقِص ہیں
اور ایسے ناقِص کہ انکا یہ فطری نقصان عورت کے سوا کوئی دوسرا
پورا ہی نہیں کر سکتا مگر چونکہ ہمارے وقت کا یہ مسئلہ نہیں ہے
اسلئے اس پر کلامِ بے فائدہ صرف تطویل ہے۔
اسی طرح میرا یہ مقصد بھی نہیں کہ عورتیں کسی ترقی کی مستحق

نہیں اور نہ میں انکو تعلیم دینے کا مخالف ہوں مجھ کو جو کچھ کہنا ہے
وہ یہ کہ انکی ترقی کا میدان کیا ہے اور انکی تعلیم کی نوعیت کیا
ہونی چاہئے تاکہ یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ عالمِ اسلامی کی مجموعی
ترقی کیلئے کیا صرف ڈگریاں پاس کرلینا یا انگریزوں کی حرص
میں عورتوں کو مردوں کے شانہ بشانہ کھڑا کردینا ضروری ہے؟
اب آپ اپنے دماغ کو بے وجہ کی بدگمانیوں اور غلط فہمیوں
سے صاف کرنیکے بعد حدیث کے الفاظ کی تشریح پر ایک امتی
کی حیثیت سے غور فرمائیے تاکہ قدرت کے اَسرار و حِکَم آپ کے
شیشۂ دل میں اُتر جائیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ عہدِ نبوی صلعم میں عیدین کی خوشی ایک
اسلامی خوشی سمجھی جاتی تھی اور اسوقت بڑی اہمیت تھی کہ کفار
کے سامنے اسلام کی بڑھتی ہوئی کثرت اور ترقی کا مظاہرہ کیا
جائے لیکن یہ بھی اتنی احتیاط کے ساتھ ہوتا تھا کہ ہر عورت اپنی
چادر میں سرتاپا لپٹی ہوتی تھی اور مردوں کی صفوں سے بالکل
آخر میں انکی صفیں قائم ہوتی تھیں اور اسکی سخت ترین ممانعت
تھی کہ کوئی عورت مزیّن لباس میں یا خوشبو لگاکر نماز کیلئے آئے،
حالانکہ وہ زمانہ صحابیہؓ کا زمانہ تھا اور محفل ایک اولوالعزم

معصوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہوتی تھی، آپ ان کے
رسولِ اعظم بھی تھے اور شفیق و بزرگ والد بھی، انکے مربّی اکبر بھی
اسلام کو اسوقت کفار کے مقابلہ میں مال کی بھی سخت ضرورت
تھی، ملک مفلس اور مقابلہ اہلِ ثروت وسطوت سے تھا اسلئے
صدقہ کی اپیل کرنی ضروری تھی، اس مقدس عہد میں سب سے زیادہ
اہتمام عارضی حیات کی بجائے دائمی حیات کا رہتا تھا اسلئے مال
تو مال ہمیشہ اپنے جان و مال اور اپنے ہی نہیں بلکہ اپنی عزیز تر اولاد
کی جانیں بھی اس مقصد کیلئے بڑی خوشی کیساتھ قربان کی جاتی تھیں،
اسلئے آپ نے اسی حیات دائمی کے نام پر چندہ کی اپیل کی۔
ملک گیری کی ہوس میں نہیں وہ تو خود بخود اسکا ضمنی ثمرہ بنکر
سامنے آہی جاتا تھا، اس سلسلہ میں جب عورتوں کی فطری خامیوں
کا تذکرہ آیا تو اللہ اللہ کیا ان پڑھ ملک اور کس غضب کی
تہذیب کہ اس پر نہ کوئی ایجیٹیشن ہوا نہ کوئی شور برپا ہوا بلکہ
ہر ایک کو اپنی اپنی فکر پڑ گئی اور کتنی دانشمندی، کتنی تہذیب
کا ثبوت دیا اور بڑے ادب سے اپنی خامیوں کا سوال کیا اور
جب اپنے گریبان میں منہ ڈالا تو حرف بہ حرف انکو درست پایا
اور اسی وقت ادب سے سر جھکا کر سب کی سب راضی برضائے مولا

خاموش ہوگئیں اور مہمل سوالات کا ایک حرف بھی منہ سے نہ نکلا کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ جب مادہ پرست فطرت پر اعتراض کا کوئی حق نہیں رکھتے تو ایک خدا پرست کو قدرت پر اعتراض کا کیا حق ہو سکتا ہے اسلئے اگر انکی شہادت یا دین میں کوئی نقصان ہے تو یہ قدرت کا پیدا فرمودہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ مخلوق میں کامل کوئی بھی نہیں یہاں کمال ہے تو مجموعہ میں ہے ورنہ ہر ہر مخلوق کسی نہ کسی حیثیت سے ناقِص در ناقِص ہے ہاں اگر کسی کو کامل یا ناقص کہا جاتا ہے تو یہ نسبتاً کہا جاتا ہے کیونکہ ابھی تک ہم نے کمال اور نقصان کی حقیقت کو سمجھا بھی نہیں اس لئے ہم دنیا کی اشیار پر کمال یا نقصان کا جو حکم بھی لگاتے ہیں وہ اپنی فہم کے قائم کردہ معیار سے لگاتے ہیں۔

حدیث بالا پر اگر غور کیجئے تو یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ انسانی کمال کا معیار کیا ہے اور اسی کے لحاظ سے نقصان کی حقیقت کیا ہے، اسی حقیقت کے اظہار کیلئے صنفِ نسار میں جو پہلا نقصان آپ نے بیان فرمایا وہ عقل کا نقصان تھا، اس سے معلوم ہوا کہ انسانی میں سب سے پہلا انسانی کمال عقل کا کمال ہے اسکے بعد آپ نے انکے دین کا نقصان بیان فرمایا کیونکہ دین کا

کمال عقل کے کمال پر موقوف ہے اسلئے کامل انسان وہ ہے
جو عقل و دین میں کامل ہو اور جو اِن دو میں ناقص ہو وہ
ناقص انسان ہے، شریعت میں دین کا مفہوم بہت وسیع ہے
اور انسانی زندگی کے گوشہ گوشہ پر پھیلا ہوا ہے، اگرچہ بعض
ناواقف اصحاب کے نزدیک دین کا دائرہ بہت محدود ہے،
شرعی مفہوم کے لحاظ سے دین کا کمال یہ ہے کہ انسان حقوق اللہ
اور حقوق العباد دونوں کا پورا پورا لحاظ رکھے اور جہاں اِن
دونوں قسموں میں سے کسی قسم میں خلقتاً یا عمداً کوئی نقصان
پیدا ہوا بس سمجھ لو وہیں دین میں نقصان پڑ گیا، اسکے بعد آپ نے
عورتوں کے متعلق جس صفت کا اظہار فرمایا ہے وہ دین کی
صفات میں سے بلکہ انسانیت کی صفات میں سے سب سے
بلند تر صفت ہے یعنی احسان کرنا، شرعی لحاظ سے مُحسِن ہونا
کمالِ دین کی ایک امتیازی علامت ہے اور اسی اعتبار سے
احسان فراموشی یہ سب سے بڑا نقصان ہے چونکہ عورتوں میں بالعموم
احسان فراموشی کا مادہ زیادہ نظر آتا ہے اس لئے یہ ان کے دین
اور انسانیت کے نقصان کا بدیہی ثبوت ہے۔

اس حدیث کے ان چند مختصر الفاظ میں گویا کمالِ انسانیت

کا خلاصہ نکال کر رکھ دیا گیا ہے اور اب اسی سے قیاس کر لیجئے کہ جو ان تین صفات میں ناقص ہوگا وہ دوسری صفات میں کتنا ناقص ہوتا چلا جائے گا۔

حکومت کی صلاحیت کیلئے دماغی قابلیت اور جسمانی طاقت کیسا تھ خلق اللہ کے ساتھ احسان کرنیکا جذبہ ہونا بھی ضروری ہے

(۱۴) عَنْ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیِّ رض قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَضْلُ عَائِشَۃَ رض عَلَی النِّسَآءِ کَفَضْلِ الثَّرِیْدِ عَلٰی سَآئِرِ الطَّعَامِ کَمُلَ مِنَ الرِّجَالِ کَثِیْرٌ وَّلَمْ یَکْمُلْ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَرْیَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ وَآسِیَۃُ اِمْرَءَۃُ فِرْعَوْنَ

(بخاری صفحہ ۴۸۸/۱ صفحہ ۴۸۴/۱)

ترجمہ: ابو موسیٰ اشعری رض روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (حضرت) عائشہ رض کی برتری دوسری عورتوں کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسا کہ ثرید کی (عرب میں نہایت زود ہضم، مقوی اور لذیذ ایک کھانے کا نام ہے) بقیہ سب کھانوں کے مقابلہ میں (اسکے بعد فرمایا) مردوں کا تو کیا کہنا انمیں تو بہت لوگ رتبہ کمال کو پہنچے لیکن گذشتہ

عورتوں میں جو کمال کے رتبہ کو پہنچیں ان میں سے قابل ذکر یہ چند ہستیاں ہیں (۱) حضرت مریم بنت عمران (۲) آسیہ زوجۂ فرعون۔

(۴۲) عَنْ اَنَسٍؓ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ حَسْبُکَ مِنْ نِّسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ مَرْیَمُ بِنْتُ عِمْرَانَ وَ خُدَیْجَۃُ بِنْتُ خُوَیْلِدٍ وَ فَاطِمَۃُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ وَّ اٰسِیَۃُ اِمْرَأَۃُ فِرْعَوْنَ (رواہ الترمذی مشکوٰۃ صفحہ ۵۷۳)

ترجمہ: انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تمکو عورتوں میں کامل عورتوں کا تعارف منظور ہو تو تم کو بس اِن عورتوں کا نام کافی ہے (حضرت) مریم بنت عمران (حضرت) خدیجہ بنت خویلد (حضرت) فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آسیہ زوجۂ فرعون۔

(۴۳) عَنْ اَبِیْ بَکْرَۃَؓ قَالَ نَفَعَنِی اللّٰہُ بِکَلِمَۃٍ سَمِعْتُھَا مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَیَّامَ الْجَمَلِ بَعْدَ مَاکِدْتُّ اَنْ اَلْحَقَ بِاَصْحَابِ الْجَمَلِ فَاُقَاتِلَ مَعَھُمْ قَالَ لَمَّا بَلَغَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّ اَھْلَ فَارِسَ قَدْ مَلَّکُوْا عَلَیْھِمْ بِنْتَ کِسْرٰی قَالَ لَنْ یُّفْلِحَ قَوْمٌ وَّلَّوْا اَمْرَھُمْ اِمْرَاَۃً۔ رواہ البخاری صفحہ ۶۳۷

ترجمہ: ابو بکرہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے
دہن مبارک سے ایک کلمہ سنا تھا، بس نہ پوچھو اس نے مجھ کو جنگِ جمل
میں کتنا فائدہ دیا، میں یہ ارادہ کر ہی چکا تھا کہ جنگ جمل کے لشکر
میں شریک ہو جاؤں اور انکے ساتھ میں بھی جنگ شروع کر دوں وہ
کہتے ہیں وہ کلمہ یہ تھا کہ جب آپ کو یہ خبر پہنچی کہ اہلِ فارس نے زمامِ حکومت
کسریٰ کی لڑکی کے سپرد کر دی ہے تو یہ سنکر فرمایا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ
وہ قوم کبھی کامیاب ہو سکے جس نے اپنے معاملات کی باگ ڈور ایک
عورت کے ہاتھ میں دیدی ہو (اس بنا پر میں حضرت عائشہؓ کے زیرِ قیادت
لشکر میں شریک نہ ہوا)

شرح: احادیث مذکورہ میں پہلی امتوں میں سے نام لیکر صرف
دو عورتوں کو بتلایا گیا ہے جنکو صنفِ نساء میں کامل کہا جا سکتا
ہے، یہ آپ پہلے پہچان چکے ہیں کمال کی تعریف کیا ہے؟
اصطلاحی الفاظ میں قدیم فلسفہ میں کمال کی دو قسمیں کی گئی
ہیں ایک قوتِ نظریہ، ایک قوتِ عملیہ، ان الفاظ کا جتنا بھی
تجزیہ کیا جائے اسکا خلاصہ آخر میں صرف یہی نکلے گا کہ عقل اور
عمل، اعمال میں صفتِ احسان کا کمال انکی جتنی تفصیلات
بھی کریں وہ سب ان ہی الفاظ کے تحت درج ہونگی، اسکے

بعد جب قرآنی آیات کو دیکھا جاتا ہے تو ان میں بھی عورتوں میں سے نام لیکر صرف ان دو عورتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے ایک حضرت مریم اور دوم آسیہ زوجہ فرعون وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ۔ رالیٰ آخر سورۃ التحریم)
(اور اللہ نے بتائی ایک مثل ایمان والوں کے لئے عورت فرعون کی)

(پارہ ۲۸ رکوع ۲۰)

ان آیتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ان دو عورتوں میں سے جو مؤمنوں کیلئے بھی اس قابل ہیں کہ انکو بطریق مثال بیان کیا جائے ایک عورت آسیہ فرعون کی بیوی ہیں جنہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پرورش میں بڑی محنت اور محبت سے حصہ لیا تھا جب فرعون کو بعد میں انکی قلبی حالت کا علم ہوا تو اس نے انکو طرح طرح کے عذاب میں مبتلا کیا لیکن انہوں نے اس صبر و استقامت سے کام لیا کہ ان پر اس تعذیب کا ذرہ برابر بھی کوئی اثر نہ پڑا حتیٰ کہ اپنی جان دیدی۔ دوسری عورت حضرت مریم ہیں ان کا کہنا ہی کیا، پاکدامنی میں ضرب المثل بنیں اور عبادت گذاری میں مردوں کی صف میں شمار ہوئیں۔

جب ان دو عورتوں کے متعلق قرآنی بیان کردہ الفاظ پر

نظر کی جاتی ہے تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم کی صفات
میں دو صفتیں اتنی ممتاز تھیں کہ ان میں کوئی عورت امم سابقہ
میں انکے ہم پلّہ نہیں تھی، ایک عفّت و پاکدامنی جو اس درجہ پر
پہنچی ہوئی تھی کہ آج تک وہ اس صفت میں ہی ضرب المثل
بنی ہوئی ہیں اور قرآن نے بھی خود انکو اس صفتِ خاصہ میں
مَثَل ہی کے طور پر اس امت کے سامنے پیش کیا ہے، دوسری صفت
جو قرآنی الفاظ سے انکی نمایاں ہوتی ہے وہ عبادتِ الٰہی ہے اور
وہ بھی اس درجہ کی کہ جسکی بناء پر انکو عورتوں کی صفوں سے نکالکر
عبادت گزار مردوںکی صفوں میں شامل کر دیا گیا ہے، اسی لئے
عربی کے لحاظ سے آیتِ مذکورہ میں وَکَانَتْ مِنَ الْقَانِتَاتِ
کے بجائے وَکَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِیْنَ فرمایا گیا ہے، گویا وہ صفتِ
عبادت میں اتنی بڑھی ہوئی تھیں کہ انکی مثال عورتوں میں نہیں
مِل سکتی مردوں میں ہی مل سکتی ہے۔

اس کے بعد دوسری عورت کا کمال اس سے ظاہر ہوتا ہے
کہ جو شقیِ ازلی مدعی الوہیت کی بیوی ہو اس نے کسطرح اس
تنگ ماحول میں اپنے ربّ حقیقی کو پہچانا اور کسطرح دنیوی عیش و
راحت سے بیزار ہو کر بن دیکھی جنت کی دعا کی اور کس صبر کیساتھ

فرعون کی ظالمانہ تعذیب کا کوئی اثر نہ لیا، لیکن یہ ظاہر ہے کہ
ان دونوں صفتوں میں کوئی صفت بھی ایسی نہیں ہے خواہ
وہ کتنی بھی صفتِ کمال ہو جو حاکمیت کی صلاحیت کی خبر
دیتی ہو، اس امت میں جن دو عورتوں کا نام لیا گیا ہے ان
میں سے ایک حضرت عائشہ رضؓ ہیں اور دوسری حضرت خدیجہؓ،
ان دونوں کے کمالات سے اُمتِ محمدیہ خوب آشنا ہے،
اسکی تفصیل کی ضرورت نہیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ حضرت
مریم کے بالمقابل اس امت میں حضرت عائشہؓ نظر آتی ہیں،
جنکی پاکدامنی کے متعلق قرآن میں مستقل ایک سورت نازل
ہوئی ہے، اور حضرت خدیجہؓ کی عقل و فراست کی کیا داد دی جا
سکتی ہے جنہوں نے کفر کے ماحول میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کی نبوت کو اس جزم و یقین کے ساتھ پہچان لیا جیسے ایک
مشّاق سنار ایک نظر میں کھرے سونے کو پہچان لیتا ہے اور
جانی و مالی قربانی کا وہ ثبوت دیا جسکی مثال ملنی مشکل ہے،
اس عظمت اور بزرگی کے باوجود حاکمیت و امامت کی صلاحیت
کیلئے جو صفات درکار تھیں وہ ان مقدس در مقدس ہستیوں
میں بھی شرعی لحاظ سے مفقود تھیں، حضرت سیدۃ النساء کے

فضائل سے حدیثیں بھری پڑی ہیں اگر عورتوں میں کوئی حاکمیت
کی مستحق ہوتی تو اس کی وہ پہلے مستحقین کی صف میں شمار ہوتیں
لیکن اسکے لئے دورِ اوّل میں بھی ان کی طرف نظریں نہیں اٹھیں۔

اسلام میں امامت کی دو قسمیں ہیں امامت صغریٰ یعنی
نماز کا امام اور امامتِ کبریٰ یعنی مسلمانوں کے عام نظم و نسق کا
امام، پھر امامتِ صغریٰ کا منصب بھی امام اکبر میں مندرج تھا،
یعنی نماز کا امام بھی خود امامِ اکبر ہوتا تھا یا وہ شخص ہوتا تھا جو
اس کا مقرر کردہ ہو، ایسا کیوں تھا؟ یہ بحث بہت طویل ہے
جس کا یہ محل نہیں۔

اس لحاظ سے بھی اگر آپ دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا
مذکورۂ بالا اِن مقدس عورتوں میں سے کسی میں جب اسکی
صلاحیت بھی نہ تھی کہ وہ نمازوں میں مردوں کی امام بنائی
جا سکیں تو انکے حاکم عام بننے کا سوال ہی کیا پیدا ہو سکتا ہے؟
اسمیں عورتوں کا کوئی نقصان ثابت نہیں ہوتا اور انکے کمال
کو کوئی ٹھیس نہیں لگتی، جس طرح مرد کہ اگر ولادت نہیں ہوتی
تو اس سے اس کا نقصان ثابت نہیں ہوتا اور اسکے کمال پر
کوئی حرف نہیں آتا، کیونکہ ہر صنف کا کمال علیحدہ علیحدہ ہے،

اور اس لحاظ سے اگر عورت شرعی نظر میں حکمراں نہیں ہوسکتی بلکہ نماز میں مردوں کی امامت بھی نہیں کر سکتی تو اس سے اُسکی عزت واحترام میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔

مذکورۂ بالا صفحات میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ کمال جس کا نام ہے وہ عقل اور دین اور انسان میں محسن ہونے کی صفت کا نام ہے، قرآن شریف کی ایک دوسری آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کی صلاحیت کے لئے دماغی لیاقت اور جسمانی قوت وطاقت کی بھی ضرورت ہے، حضرت طالوت علیہ السلام اور جالوت بادشاہ کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت طالوت علیہ السلام کی لیاقت اور حکومت کی صلاحیت کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا گیا ہے: وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ط (اور زیادہ فراخی دی اسکو علم اور جسم میں) (پارہ ۲ رکوع ۱۶)

اس لحاظ سے بھی اگر دیکھا جائے تو مرد اور عورت کی دو صنفوں میں مجموعی لحاظ سے جتنی دماغی لیاقت اور جسمانی طاقت مردوں کی صنف میں ثابت ہوتی ہے اتنی صنف نساء میں ثابت نہیں ہوتی اور آج جہاں کہیں عورتوں کی حاکمیت کا ثبوت شاذ و نادر طور پر ملتا بھی ہے تو یہ بات ثابت ہو کر رہی ہے،

کہ وہاں بھی اندرونی طور پر مرد کی طاقت کام کرتی ہوئی نظر آتی ہے، یہی وجہ ہے کہ شرعی نقطۂ نظر کو چھوڑ کر اگر آپ تاریخی صفحات میں تلاش کریں تو دنیا کی تاریخ میں صنف نساء میں حاکمیت کا حصہ برائے نام ہی ثابت ہوتا ہے۔

آخر میں قلم یہ لکھنے پر مجبور ہے کہ حاکم میں دیگر صفات کے سوا سب سے بڑی صفت یہ ہونی چاہئے کہ وہ زیردست رعایا پر احسان کیلئے مضطر ہو انکی جفاؤں پر اسکے دل میں ذرا انتقام کا خیال نہ گذرے بس ہمہ تن شفقت ہی شفقت ہو پھر سوچئے کہ جنمیں صفتِ احسان کی بجائے کُوٹ کُوٹ کر اپنے محسن کی احسان فراموشی بھری ہوئی ہو، ذرا ذرا سی بات پر تیزی و ناگواری کی سرشت موجود ہو وہ صنف بھلا حاکمیت کی صلاحیت کیا رکھ سکتی ہے؟ اب اگر آپ فطری اور شرعی و تاریخی جملہ حیثیات سے قطع نظر کر کے نئی جدوجہد اسی پر شروع کریں کہ عورتوں کو بھی مردوں کے شانہ بشانہ نظم و نسق کی ہر ہر صف میں نظر آنا چاہئے تو یقیناً یہ ایک نیا تجربہ ہوگا اور اسکو کامیاب کہہ دینا یہ شاید بہت قبل از وقت ہو کیونکہ جب ہزاروں سال کا تجربہ اسکے خلاف ہے تو جب تک ہزاروں سال کا آئندہ تجربہ

گذشتہ تاریخ کی تکذیب نہ کردے اسوقت تک اس جدید تجربہ کو کامیاب سمجھ لینا انسان کی فطری عجلت پسندی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

اب آیئے علمِ تشریح کی رُو سے بھی صنف نساء پر ایک نظر ڈالتے جائیے، تاکہ یہ اندازہ کیا جاسکے کہ کیا عورتوں کو حاکم بنا دینا یہ انکے لئے خواہ ترقی کی راہ ہو یا نہ ہو، لیکن عالم کے نظم ونسق قائم کرنیکے لئے موزوں ہوگا کہ نہیں؟

عورت علمِ تشریح کی نظر میں

آج سے تقریباً بیس۲۰ پچیس۲۵ سال قبل میں نے ایک کتاب "اَلْمِرْأَۃُ الْمُسْلِمَۃُ" دیکھی تھی جسکا ترجمہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے "مُسلمان عورت" کے عنوان سے کیا تھا، اسمیں مرد وعورت کے اعضائے ظاہری اور حواسِ خمسہ میں علمِ تشریح کی روشنی میں یہ واضح کیا گیا تھا کہ عورت مجموعی لحاظ سے مرد سے فطرتاً زیادہ ضعیف پیدا کی گئی ہے، میں نے اسی وقت اپنے ذوق کے مطابق اسکی ایک یادداشت اپنے پاس رکھ لی تھی، حسنِ اتفاق سے اسوقت وہی میرے سامنے ہے اور اصل کتاب نہ اس وقت

میرے پاس موجود ہے نہ اسکے مطالعہ کی ہمت وطاقت، اسلئے نقشہ ہائے ذیل میں جو اوزان نقل کئے گئے ہیں وہ اسی نقل کی بنا پر ہیں، بہت ممکن ہے کہ اسمیں کہیں قلم سے سہو ہو گیا ہو اگرچہ انشاء اللہ اس کی امید کم ہے :-

مرد اور عورت کے طول میں اوسطاً ۱۲ سنٹی میٹر

کا فرق ہے

جسامت :-

مرد کے ثقلِ جسم کا اوسط	عورت کے ثقلِ جسم کا اوسط
۴۷ کیلو	$\frac{1}{2}$ ۴۲ کیلو

فرق $\frac{1}{2}$ ۴ کیلو

حرارت غریزی

کاربونک ایسڈ کے جلانے کا فرق

مرد	عورت
ایک گھنٹہ میں تقریباً ۱۱ ڈرام جلاتا ہے	ایک گھنٹہ میں تقریباً ۶ ڈرام جلاتی ہے

فرق: تقریباً ۵ ڈرام

دماغ

مرد کے دماغ کے وزن کا اوسط	عورت کے دماغ کے وزن کا اوسط
۴۹ $\frac{1}{2}$ اوقیہ	۴۴ اوقیہ
۲۸۷ دماغوں کے وزن کے نتیجہ میں سب سے وزنی دماغ ۶۵ اوقیہ اور سب سے چھوٹا ۳۴ اوقیہ کا ثابت ہوا۔	۲۹۱ دماغوں کے وزن کے نتیجہ میں سب سے وزنی دماغ ۵۴ اوقیہ اور سب سے کم وزنی دماغ ۳۱ اوقیہ کا نکلا

نوٹ:۔ بیوقوفوں کے دماغ کا وزن ۲۳ اوقیہ سے کسی حالت میں زیادہ ثابت نہیں ہوا مسلم داناؤں کے دماغ کا وزن ۶۰ اوقیہ سے بھی متجاوز ثابت ہوا

قلب

عورت کا قلب مرد کے قلب سے ۶۰ ڈرام چھوٹا اور خفیف ہوتا ہے

عضلات

عورت کے عضلات اسقدر ضعیف ہیں کہ اگر انکی طبعی قوت کے تین حصے کئے جائیں تو دو حصے مرد میں اور ایک حصہ عورت میں ثابت ہو گی یہی نسبت انکی سرعت اور ضبط میں بھی ہے.

حواس خمسہ

قوت شامہ

(الف) عورت ایک خاص فاصلہ سے "عطر لیموں" کی خوشبو محسوس نہیں کر سکتی اور مرد اس درجہ کی خوشبو کو آسانی سے محسوس کر لیتا ہے جس سے دو چند مقدار کی خوشبو سے عورت کو احساس ہو سکتا ہے.

(ب) عورت ہلکے سے "براسک ایسٹر" کی بو $\frac{۱}{۲۰۰۰۰۰}$ کی نسبت سے اور مرد $\frac{۱}{۱۰۰۰۰۰}$ سے محسوس کر سکتا ہے جو ضعف کی بیّن دلیل ہے

ذوق اور سمع

اسی فرق کی وجہ سے طعام کی عمدگی اور بدمزگی کے پہچاننے والے، آواز کے پرکھنے والے اور پیانو کی راگوں کے نقاد کُل کے کُل مرد ہیں

لامسہ

اسلئے جس آلام اور تکالیف کی متحمل عورت ہوتی ہے مرد
اسقدر نہیں ہو سکتا، یہ اسکے حق میں بڑی نعمت ہے ورنہ اُس
سے نازک اور تکلیف دہ فرائض کی انجام دہی ایک غیر ممکن بات ہو جاتی۔

یہ واضح رہنا چاہئے کہ مرد و عورت کے دماغوں کے وزن
کا یہ فرق جو اس سے قبل نقشہ میں دیا گیا ہے جس سے ثابت ہوتا
ہے کہ مرد کے بھیجے کا وزن اوسطاً عورت کے بھیجے سے سو ڈرام زیادہ
ہوتا ہے یہ اختلاف صرف جسمانی اختلاف کا نتیجہ نہیں کہا جا سکتا،
کیونکہ یہ تحقیق ہو چکا ہے کہ مرد کے بھیجے کی مقدار اسکی جسمی حالت سے
وہ نسبت رکھتی ہے جو چالیس کے عدد کو ایک سے ہوتی ہے مگر
عورت کا بھیجا اسکی جسمانی قوت سے چوالیس اور ایک کی نسبت
رکھتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر عورت کے بھیجے کی کمی جسمانی
ضعف پر مبنی ہے تو مقابلۃً یہ اختلاف کیوں پایا جاتا ہے، علاوہ
اسکے عورت کے سر کے بھیجے میں پیچ و خم نہایت کم ہیں اور اسکے
پردوں کا نظام بھی نامکمل ہے، اسی طرح مرد اور عورت کے
بھیجوں کے جوہر سنجابی میں بھی سخت اختلاف ہے، جوہر سنجابی
قوتِ ادراک کا نقطہ اور مرکز ہے۔

تعلیم و تربیت نسواں کا صحیح مفہوم

اب یہاں ایک سوال یہ باقی رہتا ہے کہ ابتک عورتوں کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے یہ اسکا منفی پہلو تھا، آخر ان کے لئے کوئی مثبت پہلو بھی ہے کہ نہیں؟ یعنی ان کی ترقی اور تعلیم کا میدان، اگر یہ نہیں تو پھر کیا ہے، یہ مسئلہ بھی بہت طویل الذیل اور غور و فکر کا محتاج ہے، لیکن مختصر الفاظ میں اگر آپ سمجھ سکتے ہیں تو اس مختصر رسالہ میں اتنا ہی لکھا جا سکتا ہے کہ انسانی زندگی کے دو شعبے ہیں ایک اندرونی دوسرا بیرونی، یعنی ایک باہر کی زندگی دوسری گھریلو زندگی، شریعت نے ان زندگیوں کو اس طرح تقسیم کر دیا ہے کہ بیرونی زندگی کی ذمہ داریاں مرد پر رکھدی ہیں اور اندرونی زندگی کی ذمہ داریوں کا بار عورتوں کے سر رکھا گیا ہے، اور اس طرح تقسیمِ کار سے انسانی طبقات یعنی ادنیٰ، متوسط اور اعلیٰ جملہ اقسام کو مکمل کر دیا ہے، گھریلو زندگی میں سب سے پہلے عورت کے سامنے تربیتِ اطفال اور نظامِ خانہ داری کے اہم فرائض ہیں، اسلئے انکی تعلیم و تربیت میں ان ہی چیزوں کا خیال مقدم رکھنا چاہئے جو انکے حق میں

زیادہ سے زیادہ کار آمد ہو سکیں، پھر اسی کے ساتھ اسمیں تینوں طبقات
کی رعایت بھی ملحوظ رکھنی چاہیئے تاکہ غریب گھر بھی اپنے دائرۂ وسعت
میں اتنی ہی راحت کے ساتھ بسر کر سکے جتنی کہ ایک متوسط یا
اعلیٰ طبقہ، پھر اپنی اپنی صلاحیت کے لحاظ سے جو طبقہ جتنی ترقی
کر سکتا ہے وہ کر جائے، ظاہر ہے انسانی گھروں کے مختلف طبقات
بیک وقت یکساں ترقی نہیں کر سکتے اور اسی نکتہ کی فروگذاشت
کرنیکی وجہ سے آج ہمارے بہت سے گھر ویران نظر آتے ہیں،
یعنی ایک غریب گھرانہ یہ کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنا معیارِ زندگی
ایک دم وہ بنالے جو کسی بڑے گھرانے کا ہوتا ہے، ظاہر ہے
ایک دم اسکو یہ ترقی کرنی مشکل ہوتی ہے اور اسلئے اسکو مختلف
قسم کے مصائب کا شکار بننا پڑتا ہے، اِس سے میرا مطلب یہ
نہیں ہے کہ کسی ادنیٰ طبقہ کو ترقی کرنیکا موقع نہ دیا جائے، یہ تو
حکومت کا اولین فرض ہے لیکن ظاہر ہے کہ جو ترقی تدریجی ہو سکتی
ہے اسکو فوری طور پر تو پیدا نہیں کیا جا سکتا اسکے لئے کچھ وقت
درکار ہے اور اس درمیانی وقفہ کیلئے یہ ضروری ہے کہ ہر طبقہ
اپنے اپنے وسعت کے دائرہ میں رہ کر اپنی زندگی کو راحتمند اور
بلند بناتا رہے۔

عورتوں کی زندگی پر ایک سطحی نظر ڈالنے کے بعد جو بات سب سے پہلے ہماری نظر میں آتی ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انکی بعض ذمہ داریاں اتنی اہم ہیں جنکو ہر مرد انجام نہیں دے سکتا مثلاً تربیتِ اطفال اور نظامِ خانہ داری بظاہر گو یہ بہت مختصر عنوانات ہیں مگر اسکی ذیلی دفعات مختلف طبقات کے لحاظ سے بہت وسعت رکھتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ ہم ان مسائل پر تفصیلی غور کریں آیئے اپنے غریب اور متوسط گھروں کا پہلے تھوڑا سا جائزہ لیں تاکہ انکی اصلاحی تدابیر میں ہم کو کچھ مدد مل سکے اور جو غیر اصلاحی تدابیر اختیار کی گئی ہیں انکے ترک کرنیکے وجوہات خود بخود واضح ہو جائیں۔

ہمارے غریب گھر بدقسمتی سے نہ صرف "غیر تعلیم یافتہ" بلکہ "غیر تربیت یافتہ" ہیں اسکا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے بچے گندگی میں پرورش پاتے ہیں، غذا انکے لئے مہیا نہیں ہو سکتی اور جو غذا انکے لئے مہیا ہوتی ہے اسکا نہ اہتمام کیا جاتا ہے اور نہ اسکو وقت پر دیئے جانیکا کوئی خاص انتظام ہوتا ہے، اسطرح انکی نشو و نما میں بہت فرق پیدا ہوتا چلا جاتا ہے اور انکے ماحول کی جہالت کی وجہ سے انکی دماغی صلاحیتیں روز بروز مضمحل پڑتی چلی

جاتی ہیں حتیٰ کہ جب وہ جوان ہوتے ہیں تو جنگ وجدال کے
سوا اور کوئی چیز انکے ذہن میں نہیں ہوتی، اسی طرح جو کپڑے
بمشکل انکو میسر آجاتے ہیں وہ بھی اتنے بد قطع اور بد وضع سلے
ہوئے ہوتے ہیں کہ انکے دماغوں میں کوئی اولوالعزمی پیدا ہی
نہیں ہو سکتی بلکہ ترقی کرنے کیلئے حرص کا مادہ بھی باقی نہیں رہتا۔
اب اگر انکے گھروں پر نظر ڈالئے تو نہ اسمیں برتن، نہ سونے کیلئے
چارپائی اور نہ کوئی دوسرا انتظام نظر آتا ہے اور انمیں سے جو
چیزیں ہوتی بھی ہیں وہ گودڑ کی طرح میلی کچیلی گھر کے اندر
بکھری پڑی نظر آتی ہیں، شوہر جب محنت و مزدوری کے بعد
خدا خدا کر کے جو چند کوڑیاں جمع کر کے لاتا ہے صحیح طور پر اسکو
ٹھکانے لگانیکا سلیقہ تو کیا اسکی بیوی ذراسی دیر میں اسکو
اڑا دیتی ہے اپنا شوہر، اور اپنے بچے اگر بیمار پڑ جاتے ہیں تو
انکی تیمارداری کا تصور بھی اسکے دماغ میں نہیں آتا، غرض ہماری
اکثریت جو زیادہ تر غربت کا شکار رہے دن بدن صحت، تہذیب
اور دماغی صلاحیتوں کے لحاظ سے اتنی گرتی چلی جاتی ہے کہ
گویا وہ ایک ترقی یافتہ جانور ہو کر رہ گئی ہے، اب رہے وہ غربا
جو شہروں میں آباد ہیں وہ متوسط یا بڑے طبقہ کی حرص میں

افلاس کا شکار بنے ہوئے ہیں اور مجبوری قرض لے لیکر اپنی زندگی کے دن کاٹتے ہیں، اس لحاظ سے کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ ہمارے گھر کی عورتیں میٹرک اور ایف۔ اے میں داخلہ لینے کے بجائے یہ سیکھیں کہ ان کو اپنے بچوں کی کسطرح پرورش کرنی چاہیئے، انکی صحت اور غذا کا اہتمام کیا کرنا چاہیئے، اگر وہ بیمار پڑ جائیں تو کسی قریبی ہسپتال میں جاکر انکے علاج کی طرف توجہ کرنی چاہیئے، انکی دماغی صلاحیتوں کا اندازہ رکھنا چاہیئے اور جو انمیں شوقین یا ہونہار نظر آئے اسکو کسی تعلیم گاہ میں داخل کر دینا چاہیئے وغیرہ وغیرہ۔

اپنی خانہ داری کے امور میں، جو کچھ رزق اور سامان قدرت نے انکے نصیب میں لکھ دیا ہے اسکو کس طرح صرف میں لانا چاہیئے اور انکی صفائی و ترتیب کا خیال رکھنے میں کتنی کوشش کرنی چاہیئے اور اپنے مزدور شوہر کی اطاعت شعاری اور دلداری کتنی کرنی چاہیئے تاکہ ایک غریب آدمی جو باہر سے ابھی ابھی گالیاں سنکر آرہا ہے کم از کم اپنے گھر میں تو کچھ عزت کے سانس لے سکے اور اسطرح رفتہ رفتہ اپنی بیرونی زندگی میں بھی اسمیں خودداری اور عزتِ نفس کا مادہ پیدا ہو اور گھر کی

عورتوں کے حُسنِ سلیقہ کی وجہ سے اپنے گھر میں اپنی حیثیت کے مطابق اسکی ضرورت کا سامان اسکو اتنا مل جائے کہ وہ پیٹ بھرنے کیلئے چوری اور لُوٹ کھسوٹ کیلئے مضطر نہ ہو، خلاصہ یہ کہ ہمارے معاشرہ کی اصلاح کیلئے سب سے پہلے ہمارے سامنے ہماری قوم کے غریب گھرانے ہیں اور بالخصوص عورتیں ہیں جنکے گھروں کی بربادی کی وجہ سے مرد جرائم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اگر اس طبقہ کی اصلاح ہو جائے تو ہمارے ملک کے تقریباً نصف افراد جو جرائم کے خوگر ہو چکے ہیں ممکن ہے گھریلو اصلاح کی وجہ سے جرائم سے باز آجائیں اور بڑی حد تک چھوٹے چھوٹے جرائم کا خود بخود انسداد ہو جائے۔

اب اگر متوسط طبقہ پر نظر ڈالئے تو انکی حالت غریبوں سے بڑھ کر ناگفتہ بہ ہے اور اسکی وجہ یہ ہے کہ انکی عورتیں ہی نہیں بلکہ مرد بھی اپنے گھروں کا وہ معیاری نقشہ دیکھنا چاہتے ہیں جو اعلیٰ طبقہ کا معیار ہے، قلیل آمدنی خواہ تنخواہ کے ذریعہ ہو خواہ تجارت کے ذریعہ انکی اس حرص کا ساتھ نہیں دے سکتی، انکی بیوی، انکے بچے اپنے تن ڈھکنے کیلئے جو کپڑا بمشکل خریدتے ہیں چاہتے ہیں کہ اعلیٰ طبقہ کی وضع قطع پر اسکو تیار کرائیں اسلئے

اس پر دوگنے مصارف پڑ جاتے ہیں، اندازہ کیجئے کہ جہاں کپڑا خریدنے کی گنجائش ہی مشکل سے ہو وہاں مہنگی سلائی کہاں سے ادا کیجائے، اب رہا غذا کا مسئلہ تو وہ بھی اعلیٰ طبقہ کے معیار کے مطابق، اسی طرح برتن اور گھر کے دوسرے آرائشی سامان کہاں سے مہیا ہوں؟ اسکے بعد چونکہ انکے ذہنوں میں کچھ نہ کچھ شعور رہتا ہے اسلئے سب سے پہلے اپنی لڑکیوں کو اسکولوں کی نذر کر دیتے ہیں جسکی وجہ سے انکی فیس ادا کرنے اور ان کے لباس وغیرہ کے مصارف کا بار مزید برآں انکے کاندھوں پر آپڑتا ہے، ادھر لڑکیاں اپنی کم سنی کے باعث گھر سے باہر نکلکر جو سماں دیکھتی ہیں اور گھر کے محدود دائرہ میں اسکا عشر عشیر بھی نہیں پاتیں تو گھٹ کر رہ جاتی ہیں اور یہ غریب مسکین اگر بمشکل میٹرک یا ایف۔ اے تک پہنچ بھی جائیں تو اس قابل بھی نہیں رہتیں کہ اپنے بچوں کی تربیت کر سکیں، اپنے گھروں کو صاف ستھرا رکھ سکیں، اپنی چھوٹی موٹی چیزوں کو مرتب کر سکیں اگر وہ کم از کم فرسٹ ایڈ (FIRST AID) کی تعلیم حاصل کر لیتیں، کٹنگ اور ٹیلرنگ سیکھ لیتیں تو خود اپنے اور اپنے بچوں کے لباس کو اعلیٰ طبقہ کے برابر نہیں تو انکے

قریب قریب بنانے کے قابل ہو جائیں۔

میرے ناقص اندازے کے مطابق متوسط طبقہ کی خواتین کو ہومیوپیتھک ڈاکٹری کی تعلیم دی جانی ضروری ہے تاکہ اپنے گھر کے بچوں کا معمولی علاج وہ خود کر لیں اور معمولی معمولی بیماریوں میں ڈاکٹروں کی بڑی بڑی فیسیں اور گراں ادویات کی قیمتوں کا بار اٹھانے سے بچ جائیں، اسی طرح تقریباً تین سو انگریزی کے الفاظ ان کو سکھلا دیئے جائیں جو متوسط اور اعلیٰ گھرانوں میں غذاؤں، برتنوں، سامانِ آرائش اور بجلی وغیرہ کے متعلق عام طور پر مستعمل ہوتے ہیں، اسکے علاوہ بہت مختصر جغرافیہ جسمیں صرف ممالک کے نام، انکی آبادی، ان کے مشہور مشہور دریا، مشہور صنعتوں اور ان کی مختصر خصوصیات کا تذکرہ ہو، اسی طرح مختلف سمندروں کے نام، انکی خصوصیات مثلاً جو سردی میں منجمد ہو جاتے ہیں یا ہمیشہ منجمد رہتے ہیں، اسی طرح مشہور پہاڑوں کے نام اس قسم کی ضروری اور موٹی موٹی باتیں انکی جغرافیائی تعلیم میں داخل ہونی چاہئیں، اور یہ بھی ضروری ہے کہ ہر عورت کے گھر میں دنیا کا نقشہ ٹنگا ہوا ہو اور وہ اسکو دیکھ کر بآسانی ممالک کے نام، انکے محل وقوع اور اسی طرح

ان میں دریاؤں، ریلوں اور انکے اطراف میں سمندروں کے ناموں
کو دریافت کرسکے، اسکے بعد یہ بھی ازبس ضروری ہے کہ ان کو مشہور
شاہانِ اسلام کے مختصر حالات سنہ وار اور انکی خصوصیات کے
ساتھ پڑھائی جائیں اور اُردو کی تعلیم اونچی سے اونچی دیجائے
کیونکہ اس زبان میں مذہب کے ہر ہر شعبہ کے متعلق مکمل تراجم
موجود ہیں، تاکہ جس عورت کا دل چاہے وہ تاریخ اسلام کا مطالعہ
اپنی زبان میں باسانی خود کرسکے اور اگر اس آخری دور میں کوئی
خوش نصیب ایسی ہو کہ اپنے مذہب کے مطالعہ کی توفیق نصیب
ہوجائے تو وہ احادیث و قرآن اور اپنی زندگی کے ضروری
مسائل خود ہی مطالعہ کرکے آخرت میں اپنی سرفرازی کے
سامان مہیا کرے۔

اب رہ گیا اعلیٰ طبقہ تو انکے دماغ اتنے بلند ہوچکے ہیں
کہ انکے متعلق مجھ جیسے عاجز کا کچھ لکھنا سودمند نہیں ہوسکتا،
عنقریب آپ دیکھیں گے کہ زمانہ کے انقلابات انکو خود بخود
سیدھا کردیں گے اور اسکے بعد وہ حسرت کرینگے کاش وہ اپنی
اصلاح خود اپنے ہاتھوں پہلے کرلیتے، کتنی بھی ڈگریاں حاصل
کرلی جائیں مگر عورتوں کے امبیسیڈر (AMBASSADOR)

بننے میں کچھ مخفی راز بھی ہوتے ہیں، ہاں اسکول کی ماسٹرنیاں
بننا اگر کچھ فخر ہو تو سفارشوں کے بعد اسکے امکانات قوی
ہیں، وزارت اور افسری کیلئے بھی صرف لیاقت کافی نہیں ہے
بلکہ اسکے لئے بھی کچھ رموز درکار ہیں، یہ اعلیٰ طبقہ ہماری قوم
میں بہت تھوڑا ہے مگر بدقسمتی سے اسکے متعدی اثرات نے
ہمارے قومی معاشرہ کو بالکل تباہ کر رکھا ہے، میں ان کے متعلق
زبان ہلانا نہیں چاہتا صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جبکہ
قدرت نے ان کو عزت و مال دونوں سے نواز دیا تو اگر کاش
وہ اپنا معیارِ زندگی متوسط بنالیں تو انکی شان میں تو کوئی
فرق نہ پڑیگا لیکن ہمارے غریب اور متوسط طبقہ کے لئے ترقی
کا میدان بہت وسیع ہوجائیگا، یعنی اپنے دائرۂ وسعت سے
نکل کر ان میں جو بیجا ہوس پیدا ہوچکی ہے وہ انمیں باقی
نہ رہیگی، یہ انکا اختیار ہے کہ اگر وہ ترقی اسی میں سمجھتے ہیں
کہ وہ اپنی معصوم لڑکیوں کو امریکہ اور لندن بھیجکر اجنبی
ملک اور غیر اسلامی طریقوں کا عادی بنائیں اور ان کے
عواقب اور انجام کی کوئی پروانہ کریں تو اسکی ذمہ داری
ان ہی کے سر ہوگی لیکن یہ ہوس اپنے دل سے نکالدیں کہ اگر

عورتیں کثیر تعداد میں بیرونی ڈگریاں حاصل کر کر کے اپنے ملک میں واپس آجائیں تو وہ کوئی ملک کی ترقی کا باعث بن سکیں گی، ہاں یہ ممکن ہے کہ بہت سی ان میں سے دوسرے ممالک ہی میں آباد ہو جائیں اور جو واپس آئیں وہ اپنے ملک کی محبت کی بجائے دوسرے ترقی یافتہ ممالک کی محبت لیکر واپس آئیں پھر وہ اپنے ملک کی ترقی کا باعث بھلا کیا بن سکتی ہیں؟ تعلیمی لحاظ سے ابھی ہمارے پس ماندہ ممالک میں بھی تعلیم یافتہ مردوں کی اتنی کثرت ہے کہ ان ہی کو ملازمت ملنی مشکل ہو رہی ہے تو اگر اپنے گھروں کی فارن کرنسی (FOREIGN CURRENCY) برباد کر کے عورتیں اپنے ملک کا مفاد پیدا کرنا چاہیں بھی تو اوسطاً اس فائدہ سے اسکا نقصان کہیں زیادہ رہیگا، اسلئے یہ ضروری ہے کہ خاص کر عورتوں کی تعلیم میں تینوں طبقات کی رعایت رکھی جائے اور ہر طبقہ کی تعلیم کا معیار اسکے لحاظ سے ہو، پھر آہستہ آہستہ ادنیٰ طبقہ متوسط میں اور متوسط اعلیٰ میں ترقی کر کر کے داخل ہوتا رہے حتیٰ کہ کچھ سالوں کے بعد تمام ملک حسنِ معاشرت، حسنِ معیشت، حسنِ اخلاق اور حسنِ کردار کے لحاظ سے اپنے اپنے صحیح لیول (LEVEL) پر نظر آئے، لیکن یہ

آسان بات نہیں حکام کی دلسوزی، مکمل ہمدردی، بڑے ایثار
اور انتہائی جدوجہد اور بے حد دلچسپی کے بعد ہی ہو سکتا ہے،
اگر نفسی نفسی کا یہی بازار گرم رہا تو ہماری قوم کا نقشہ بہت
جلد بدلکر تاریخ میں ایک عبرتناک انقلاب حوادث کی شکل
میں باقی رہ جائیگا، اور اس انقلاب کی ابتدا اور بنیاد ہمارے
گھروں کی عورتیں ہی ہونگی، اگر آج آپ کو اسکا یقین نہیں
آتا تو کل تجربہ آپ کو بتلا دیگا کہ حقیقت اس سے کہیں دُور نہ تھی۔

اس جگہ بے موقع نہ ہوگا اگر میں چند سطور اپنے قومی
لڑکوں کیلئے بھی لکھ دوں یہ بہت عظیم غلطی ہے کہ لڑکوں کے
دماغوں کا جائزہ لئے بغیر انکے والدین صرف اپنی رائے کے
مطابق ان کو تعلیم دلائے چلے جاتے ہیں، سب سے بڑی
ضرورت اسکی ہے کہ اسکے لئے مستقل ایک کمیٹی حکومت کی
طرف سے قائم ہو جو ایف اے تک تعلیم کے بعد بچوں کے دماغوں
کا یہ جائزہ لے کہ انکے طبعی رجحانات اور دماغی صلاحیتیں
کس طرف مائل ہیں جسکا دماغ ڈاکٹری، انجینیرنگ یا اقتصادیات،
صنعتی معلومات یا ایگریکلچر (AGRICULTURE) غرض جدید
تقاضوں کے جس شعبہ سے بھی مناسبت رکھتے ہوں اسی لائن پر

انکو چلایا جائے، اگر ایسا نہ کیا گیا تو بہت سے وہ دماغ جو اپنی دماغی خاص خاص صلاحیتوں کی وجہ سے خاص خاص لائنوں میں نمایاں ترقی کر سکتے تھے وہ اسکے خلاف چلنے کی وجہ سے بہت پیچھے بلکہ بیکار ہو کر رہ جائیں گے، ڈرتے ڈرتے یہ لکھنے کو بھی جی چاہتا ہے کہ اگر کسی ہونہار بچے کے دل میں یہ تمنّا ہو اور اسکے دماغ میں یہ صلاحیت موجود ہو کہ وہ علمِ نبوت کی تعلیم حاصِل کرے تو حکومت کا جب تک کہ وہ اسلام کی طرف نسبت رکھتی ہے یہ فرض ہونا چاہئیے کہ وہ ان میں سے چیدہ چیدہ افراد کی اعلیٰ تعلیم کا بھی بندوبست کرے جو اسلام کی طرف اسکی نسبت کے شایانِ شان ہو کہ وہ بچے صرف ماڈرن ٹائپ (MODERN TYPE) کے مولوی بنکر نہ رہ جائیں۔

مرد اور عورتوں کیلئے تعلیمی درسگاہوں میں اسلامی تربیت کا لحاظ اور اسلامی معاشرت کی فوقیت کا اہتمام اگر نہ کیا گیا تو یہ اچھی طرح یاد رکھنا چاہئیے کہ اگر مسلمان قوم دنیا میں کتنی بھی ترقی کر جائے لیکن وہ بحیثیت مسلمان ہونیکے نہیں ہوگی بلکہ بحیثیت ایک انسان ہونیکے ہوگی اور یہ ترقی بالفرض اگر

حاصل بھی ہو جائے تو گو معاد سے غافل دماغوں کیلئے کچھ دن کیلئے سبز باغ نظر آئے تو آئے لیکن معاد یعنی آخرت کی دائمی زندگی کے لئے انتہائی مہلک اور لاعلاج ہو کر رہے گی۔

یہ جو کچھ آپ سے کہا گیا اسکی حیثیت صرف ایک الف لیلہ کی سی ہے جو آپ نے سُن لی لیکن آپ اگر درحقیقت دنیا میں زندہ رہنا چاہتے ہیں تو آپ کو سب سے پہلے اپنی اسلامی معاشرت کو زندہ کرنا ہوگا جسکے لئے سب سے اہم درسگاہیں خود آپ کے گھر ہیں اگر ہم اپنے گھر یعنی اپنی عورتوں کو جو درحقیقت ہماری اسلامی معاشرت کی بنیادیں قائم کرنے والی ہیں ایسی تعلیم و تربیت دیں کہ وہ قوم کے آئندہ نونہالوں کو ٹھوس طریقہ پر اسلامی معاشرت کے سانچے میں اس طرح ڈھال کر باہر نکالیں کہ پھر دنیا کی کوئی دوسری معاشرت ان پر اثر انداز نہ ہوسکے جیسا کہ مشترکہ ہند میں کبھی ہندؤں نے گرد کل کے نام سے بنارس یونیورسٹی قائم کی تھی، اسکے طلباء کی علمی استعداد اور رہائش کی سادگی اور مذہبی عقائد کی پختگی یا تعصب کا حال مشہور ہے اور سب تعلیم یافتہ طبقہ کو خوب معلوم ہے، اس کے بالمقابل میں یہاں علماء کا نام لینا نہیں چاہتا کہ ان سے آپکو

کوئی دلچسپی نہیں ہے بلکہ سب سے پہلے سر سید جو بانیِ علی گڑھ کالج تھے اور جنکا فوٹو آج تک لوگوں کے گھروں میں بڑی عزت کے ساتھ موجود ہے ان کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں، میں ان کی زندگی پر کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتا بلکہ صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ انہوں نے علی گڑھ کے طلباء کے لئے ایک ایسا یونیفورم (UNIFORM) بھی مقرر کر دیا تھا کہ وہ ہندوستان بھر میں ہر فرقہ سے علیٰحدہ ممتاز نظر آتے تھے اور وہ خود بھی اس لباس کو بڑی عزت کی نظر سے دیکھتے تھے، وہ لباس سیاہ شیروانی سفید پائجامہ، سیاہ پمپ اور ٹرکش کیپ تھا، انہوں نے کالج میں ایک عالیشان مسجد بھی تعمیر کی تھی اور طلباء پر جماعت کی پابندی بھی لازم قرار دی تھی اور جو نماز نہ پڑھے اُس پر جرمانہ بھی مقرر کیا تھا، اگرچہ وہ جرمانہ ایسا تھا کہ جو طلباء نماز میں شریک ہونا نہ چاہتے وہ اپنی فیس کے ساتھ ایک ماہ کی نمازوں کا جرمانہ بھی جمع کر دیتے تھے اور وہ قابلِ قبول سمجھ لیا جاتا تھا، اکبر الہ آبادی جو بڑے فاضل ججوں میں گذرے ہیں انکے خیالات کا اندازہ انکے اشعار سے ہو سکتا ہے۔ نمونہ کے طور پر ایک شعر ہی دیکھ لیجئے:۔

نہ نماز ہی نہ روزہ نہ زکوٰۃ ہی نہ حج ہی ٭ تو پھر اسکی کیا خوشی ہو کوئی جنٹ کوئی جج ہی

علامہ اقبال مرحوم جنکے دماغ میں سب سے پہلے پاکستان کا تخیل گذرا تھا جس پُر درد انداز میں اپنے قومی تنزل اور دوسری اقوام کی نقالی کا شکوہ کر گئے ہیں وہ آج کسی پر مخفی نہیں ہے۔

یہ تینوں شخصیتیں وہ ہیں جو نہ خود محتاج تعارف اور نہ انکے خیالات محتاجِ تعارف، لیکن اگر صحیح معنٰی میں ہم وہی اسلامی زندگی چاہتے ہیں جو علامہ اقبال مرحوم کی تمنا تھی جسکا مرثیہ وہ ان الفاظ میں پڑھ گئے ہیں ؎

فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی　　رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی
مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے　　یعنی وہ صاحبِ اوصاف حجازی نہ رہے

تو پھر یہ داستان بہت طویل ہے مجھکو تو یہ بتانا ہے کہ اگر اسلامی زندگی کا صحیح نقشہ کوئی حقیقت رکھتا ہے اور ہم اپنے آپ کو دل سے اس سانچہ میں ڈھالنا چاہتے تو اس کیلئے کیا ہمارے موجودہ اسکول اور کالج کافی ہیں یا ہم کو ان درسگاہوں میں آنے سے پہلے جب ہماری نرم فطرت میں اتنی لچک تھی کہ ہم جس سانچہ میں اسکو ڈھالنا چاہیں طبیعت اور عادت کے درجہ میں ڈھال سکتے ہیں، اسکے لئے وہی زمانہ اور اپنے گھر کا اسکول تھا، یہ سوچنا چاہئے کہ کسی خاص جانور کے گوشت سے ایک ہندو کو نفرت یا ایک مسلمان کو نفرت ہی تو کیا یہ کسی تعلیم کا نتیجہ ہے

یا ان تاثرات کا جو وہ اپنے گھر سے لیکر باہر آیا ہے اسی طرح اگر آج کسی
قوم کو پتے پر کھانا رکھکر یا چوکا لگا کر کھانے میں عزت محسوس ہوتی ہے
تو یہ کسی تعلیم کا ثمرہ ہے یا اسکے گھر کی تربیت کا، اسی پر زندگی کے تمام
گوشوں کو قیاس کرتے جائیے تو آپکو معلوم ہوگا کہ جتنے گہرے نقوش
انسانی فطرت پر اسکے دورِ طفولیت میں قائم ہو سکتے ہیں وہ بعد میں
ہرگز نہیں ہو سکتے نہ کسی تعلیم سے اور نہ کسی تربیت سے اگر یہ صحیح ہے تو
پھر آپکو یہ فیصلہ کر لینا ضروری ہے کہ ہم کو اپنے گھروں کی زندگی اور
اپنی عورتوں کو کس قسم کے کورس کے تعلیم دینے کی ضرورت ہے۔
بنیادی لحاظ سے مسلمانوں کی کتاب قرآنِ پاک ہے لیکن سوال
یہ ہے کہ کیا اسکی تعلیم صرف اسی طرح کافی ہو سکتی ہے جسطرح کے مسلمانوں
کے بچے مشن اسکول میں انجیل پڑھ لیتے ہیں یا اسکے ساتھ وہ والہانہ
عقیدت اور شیفتگی پیدا کرنی بھی ضروری ہو کہ اسکا ہاتھ لگانا بلا وضو
کے ممکن نہ ہو اور اسکی تلاوت کئے بغیر ہمارے دل کو چین نصیب نہ ہو،
ہم صرف نماز اور روزہ نہیں بلکہ اپنی نشست و برخاست اور زندگی
کے گوشہ گوشہ میں اسلامی معاشرت کے سانچے میں ایسے ڈھل جائیں
کہ ہماری نظریں اسکے خلاف ہر معاشرت کو بہت پست تصور کرنے پر
ایسی ہی مجبور ہو جائیں جیسا کہ بدقسمتی سے آج ہم اپنی اصلی معاشرت

کو لپست تصور کرنے پر مجبور نظر آتے ہیں، اسلئے یہاں صرف قرآن کے
الفاظ رٹا دینا کافی نہیں ہوگا بلکہ اسکے ساتھ ایک ایسا نصاب بھی
بنانا ہوگا جسمیں کہ اُردو زبان میں اسلامی عقائد اور اعمال، عبادات
و معاملات، طعام و شراب، لباس حتیٰ کہ زندگی کے ایک ایک گوشہ
کی تفصیلات موجود ہوں، اسمیں ہمارے گذشتہ خلفاء راشدین اور
دیگر اکابر اور گذشتہ سلاطین کی صحیح تاریخ بھی شامل ہو، مقدس
بیبیوں کی اسلامی جانبازی اور پڑوسیوں کے ساتھ ہمدردی کے
واقعات اس مؤثر انداز میں پڑھائے جائیں کہ ہمکو بجا طور پر اپنی تاریخ
کے دُہرانے پر فخر محسوس ہونے لگے اور یہ بات ہمارے دماغوں میں
گذرنے بھی نہ پائے کہ ہم دنیا میں کسی دَور میں بھی حاکم نہ تھے بلکہ
یہ جذبہ پیدا ہو کہ جو آج حاکم نظر آتے ہیں یہ مدتوں ہمارے محکوم رہ
چکے ہیں اسلئے پھر ہمکو اپنی گدی سنبھالنی ہے اور نفوسِ انسانی
کی نگہبانی اور اقوامِ دنیا کی پرورش اسطرح کرکے دکھا دینی ہے
جو آج دنیا میں کسی قوم کو نصیب نہیں یعنی دنیا میں ترقی یافتہ قومیں
آج جو کچھ کر رہی ہیں وہ صرف اپنے اغراض اور اپنے جینے کے خاطر
کر رہی ہیں لیکن مسلمان کی زندگی اس سے کہیں بالاتر ہے وہ اپنے
لئے اور اپنی غرض کیلئے کچھ کرنا نہیں چاہتا، وہ خدائی خلیفہ ہے

اور چاہتا ہے کہ اپنی خلاقت کا حق ادا کرے اور اسکی صورت یہ ہو کہ خدا کی تمام مخلوقات پر اسکا خلیفہ بنکر سب کو راحت کی زندگی میں دیکھنا اسکا منتہائے نظر ہو، یہاں یہ تنبیہ کر دینا ضروری ہے کہ جو چیز ہمارے گھروں سے اسوقت مفقود ہو چکی ہے اور پھر ہمکو پیدا کرنی ہے وہ اسلامی تربیت ہے یہ خوب یاد رکھ لینا چاہیئے کہ تعلیم خواہ کچھ بھی ہو یعنی انگریزی ہو یا عربی لیکن اگر تربیت اسلامی نہیں تو اسکا کوئی مفید ثمرہ نہیں نکل سکتا اور اگر تربیت اسلامی ہو بشرطیکہ وہ پختہ ہو تو پھر تعلیم خواہ کسی قسم کی ہو وہ مضرت رساں نہیں ہو سکتی، اگر اس نکتہ کو معمولی سمجھا گیا یا قدیم خیالات کی ترجمانی سمجھ کر ٹال دیا گیا تو یہ اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہمارے گھروں اور بچوں میں اور عیسائی گھروں اور بچّوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو گا اور آپ کا اسلام اسلام چیخنا صرف بے معنیٰ نعرہ ہی ہو گا، کوئی قوم اُس وقت تک بحیثیت قوم کے دنیا میں زندہ نہیں رہتی جبتک کہ وہ اپنے امتیازی نشانات کو زندہ نہ رکھے، اگر اسکا نام آپ تعصب رکھتے ہیں تو میں بہت صفائی کے ساتھ اسلام میں اپنے متعصب ہونے کا اعلان کرنا اپنا فخر تصوّر کرتا ہُوں۔

خلق می گوید کہ خسرو بت پرستی می کنم ❊ آرے آرے می کنم با خلق ما را کار نیست

مخلوط تعلیم پر ایک طائرانہ نظر

ہمارے زمانہ میں یہ مسئلہ بھی ایک اہم مسئلہ ہے کہ لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم مخلوط ہونی چاہیئے یا علیٰحدہ علیٰحدہ، مذکورۂ بالا گذارش پر غور کرنیکے بعد یہ بات خود بخود حل ہوجاتی ہے کہ صحیح راہ ہمارے لئے کیا ہے یعنی یہ کہ جب دونوں کی تعلیم کی نوعیت ہی علیٰحدہ علیٰحدہ ہے اور انکے کورس بھی الگ الگ ہیں تو پھر مخلوط تعلیم بے معنٰی ہے مزید برآں جبکہ اسلامی معاشرت اجنبی مرد اور اجنبی عورت کے اختلاط ہی کی سرے سے اجازت نہیں دیتی تو پھر مخلوط تعلیم دیگر اس غلط طریق کی بنیاد ہی کیوں قائم کیجائے، درحقیقت یہ مخلوط تعلیم اگرچہ ظاہر میں مالی مصالح کے پیش نظر کتنی ہی بہتر نظر آئے لیکن یہ معاشرتی فساد کیلئے سب سے بڑھکر ابتری کا سامان ہے، اور اسکی تہ میں جو اصل مقصد پنہاں ہے، وہ صرف یہی ایک ہے کہ مردوں اور عورتوں کے درمیان صرف پردہ ہی نہیں بلکہ شرم اور حجاب بھی ایک طرف اٹھا کر رکھدیا جائے۔ اس حقیقت کو آپ کسی خوبصورت سے خوبصورت عنوان کے تحت چھپانا چاہیں تو وہ چھپ نہیں سکتی اور جب طاقت کے زور سے کسی مقصد کو عملی جامہ پہنانے کا عزم کرلیا جائے تو اسکو چھپانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔

میں نے بہت مایوسانہ طریقہ پر ان سطور کو سب سے آخر میں لکھا ہے کیونکہ جانتا ہوں کہ نقار خانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے، اس زمانہ میں جبکہ ہماری عورتیں اونچی ایڑیوں کے جوتے، کھلی پنڈلیوں کے لباس، کٹے ہوئے بال اور عُریاں لباس کی عاشق ہوں تو اس بھڑکی ہوئی آگ میں میرے یہ چند فقرے کیا کارآمد ہو سکتے ہیں۔

میرا مقصد تو یہ ہے کہ دین تو برباد کر دیا اب دُنیا تو برباد مت کرو، قبر کا یقین تم کو نہیں، حشر کا تم کو نہیں، فرشتوں کا یقین تم کو نہیں، جنت اور دوزخ کا یقین تم کو نہیں، پھر حساب و کتاب کا تم کو غم ہو تو کیا ہو، اگر ایسا اسلام لے کر اپنے خدا کے سامنے آنے پر خود راضی ہو تو میرے آنسو بہانے سے تمہارا دل کب پسیج سکتا ہے، صرف اسلامی ہمدردی ان کلمات کو لکھنے پر مجبور کرتی ہے۔

من قماش فروشِ دلِ صد پارہ خویشتم

دُعا کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں، خدا تعالیٰ توفیق دے کہ اس میں غفلت نہ ہو اور مسلمانوں کی خیر خواہی اور اصلاح کے لئے اسکی بارگاہِ بے نیاز میں ہمیشہ ہاتھ اٹھتے رہیں۔

عورتوں کی جنگی خدمات عہدِ نبوّت میں

(۴۴) عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَغْزُوْ بِاُمِّ سُلَیْمٍ وَّنِسْوَۃٍ مِّنَ الْاَنْصَارِ مَعَہٗ اِذَا غَزَا یَسْقِیْنَ الْمَآءَ وَیُدَاوِیْنَ الْجَرْحٰی رواہ مسلم مشکوٰۃ صفحہ ۳۴۲

ترجمہ: انسؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوہ کے لیئے تشریف لیجاتے تو اپنے ہمراہ اُمِّ سُلیمؓ اور انصار کی کچھ عورتوں کو بھی لیجاتے اور انکا کام یہ ہوتا تھا کہ زخمیوں کو پانی پلائیں اور انکی مرہم پٹی کریں۔

(۴۵) عَنْ اُمِّ عَطِیَّۃَ قَالَتْ غَزَوْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ سَبْعَ غَزَوَاتٍ اَخْلُفُھُمْ فِیْ رِحَالِھِمْ فَاَصْنَعُ لَھُمُ الطَّعَامَ وَاُدَاوِی الْجَرْحٰی وَاَقُوْمُ عَلَی الْمَرْضٰی۔

رواہ مسلم مشکوٰۃ صفحہ ۳۴۲

ترجمہ: اُمِّ عطیہؓ فرماتی ہیں کہ مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمراہی میں سات غزوات میں شرکت کا فخر حاصل ہوا ہے، مرد تو جنگ کیلئے جاتے اور میں اپنے خیمہ میں رہا کرتی اور انکے لئے کھانا تیار کرتی، مریضوں کی مرہم پٹی کرتی اور انکی تیمارداری کے فرائض انجام دیا کرتی تھی۔

شرح: احادیث مذکورہ کی تشریح سمجھنے سے پہلے تین باتوں پر غور لینا ضروری ہے، پہلی بات یہ کہ عرب کی یہ قدیم عادت تھی کہ وہ بڑے بڑے معرکوں میں عورتوں کو بھی اپنے ساتھ لیجایا کرتے تھے اور زمانۂ کفر میں عورتوں کی شرکت کا بڑا مقصد یہ ہوتا کہ وہ مردوں کو جنگ میں اور تیز کرنیکے لئے ایک ماں اپنے بیٹے کو اور ایک بی بی اپنے شوہر کو یہ عار دلایا کرتی تھی کہ خبردار اگر تمنے دشمن سے منہ پھیرایا اپنی پیٹھ پر کوئی زخم کھایا، اُس دور کے عرب یوں بھی مردانگی کے جوہر رکھتے تھے مگر اگر کوئی نازک موقع پیش آجاتا تو اِس عار سے خائف ہو کر جہاں تک ممکن ہوتا میدانِ جنگ سے ذرا پیچھے قدم اٹھانے میں اپنی بڑی ذلت تصور کرتے، اب اس ماحول کو سامنے رکھئے، دوسری بات یہ سنئے کہ اسلامی ابتدائی دور کا نقشہ کیا تھا یعنی مجاہدین ایک طرف اتنی قلت میں تھے کہ مٹھی بھر مسلمانوں کو ہزاروں کفار کے ساتھ مقابلہ کرنا پڑتا تھا اسلئے جب کبھی کوئی معرکہ پیش آتا تو بچہ بچہ میدانِ جنگ میں نکلنے کیلئے تڑپنے لگتا تھا اور جب اس طرح چن چنکر ایک ایک کر کے اسلام کے شیر میدانِ جنگ میں نکل پڑیں تو مذکورۂ بالا ضروریات کو پورا کرنا عورتوں ہی کا

فریضہ رہ جاتا تھا، تیسری بات یہ جب آپ اس ماحول اور اسوقت کی ضرورت کا لحاظ کرکے اس پر آپ غور کرینگے کہ ان عورتوں کی خدمات اسوقت بھی کیا تھیں، کیا انکی کوئی باضابطہ فوج ہوا کرتی تھی، کیا وہ باضابطہ مردوں کی طرح جہاد کی مامور تھیں یا جنگ میں بھی جو خدمات انکے سپرد تھیں یہ وہی گھریلو خدمات تھیں جو وہ حالتِ امن میں بھی اپنے گھروں میں بیٹھکر انجام دیا کرتی تھیں پھر یہ کسقدر ظلم اور غیر منصفانہ نظر ہے کہ ایک طرف ان عورتوں کی یہ خدمات تو بڑی بلند آہنگی سے بیان کی جائیں مگر دوسری طرف ادھر نظر اٹھاکر بھی نہ دیکھا جائے کہ اگر یہ عورتیں ایک بار ان خدمات کیلئے گھر سے باہر نکلا کرتی تھیں تو یہی عورتیں پانچ وقت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کا شرف حاصل کرنیکے لئے مسجد نبوی کی طرف نکلا کرتی تھیں، اگر اسکی بھی کچھ اہمیت محسوس کیجاتی تو دلکو صبر آجاتا لیکن اس ناانصافی پر کسطرح صبر کیا جاسکتا ہے کہ طرح طرح کے خوشنما عنوانات سے عورتوں کو مجاہد بنانے کی توسعی کیجائے جبکہ بحمداللہ آج مسلمان مردوں کی تعداد اتنی کافی موجود ہے کہ عورتوں کی خدمات کی کوئی ضرورت ہی باقی نہیں اور اب

ہمارا احول وہ پہلا ماحول ہے لیکن انکو نماز کیلئے نکالنے کی طرف ذرا توجہ نہ کیجائے بلکہ جو عورت نماز پڑھے اسکو دقیانوسی سمجھ کر ایسا نظر انداز کر دیا جائے کہ اُس غریب کو اپنا جوڑا ملنا بھی ناممکن ہو جائے، اب رہا یہ مسئلہ کہ اس زمانہ میں عورتوں کو مساجد میں بھی آنا چاہیئے یا نہیں تو اس رسالہ میں یہ موضوع ہمارا نہیں اور نہ پردہ ہمارا موضوع ہے اسپر دوسرے رسائل کافی روشنی ڈال چکے ہیں لیکن اگر ضمنی طور پر اتنا سا کلمہ لکھتا چلوں تو زیادہ بے موقعہ بھی نہ ہوگا کہ بے پردگی اور بے حجابی میں عرفاً کچھ فرق ہو یا نہیں، جو لوگ بے پردگی کے حامی ہیں انکا مقصد یہ ہے کہ بے پردگی کیساتھ عُریانی اور بے حجابی کی بھی ضرورت ہے، اگر یہ ہے تو پھر معاف کیجئے کہ بے غیرتی اور بے حجابی میں کچھ فرق بتانا یہ آپ کا کام ہوگا۔

قرآنی آیت پر بحث کرنیوالے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں عورتوں کے پردوں کی نوعیت پر غور کئے بغیر اس سے استدلال کرنیوالے خود یہ انصاف سے بتادیں کہ جس پردہ کی آڑ میں وہ بے پردگی پھیلا رہے ہیں کیا عہد نبوت میں وہ یہی پردہ تھا کیا وہ انہی لباسوں کے ساتھ تھا کیا وہ اسی ماحول

ہیں تھا کیا وہ انہی مقاصد کیلئے تھا اگر ان سب کا جواب نفی میں ہو تو پھر بے حجابی اور بے پردگی کو اگر اختیار کرنا ہی ہے تو خدارا اسکو شریعت کے سر تو نہ رکھئے اور اسلام کیطرف تو نسبت نہ کیجئے۔

اسلامی معاشرت میں ایک اجنبی صنف کا دوسری اجنبی صنف کو ہاتھ لگانا بھی معیوب ہے، اگرچہ کفر کی معاشرت میں اسکو کتنی ہی اعلیٰ تہذیب سمجھا جائے

(۴۶) عَنْ عَائِشَةَ رضقَالَتْ فِیْ بَیْعَةِ النِّسَآءِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَمْتَحِنُهُنَّ بِهٰذِهِ الْاٰیَةِ یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَكَ فَمَنْ اَقَرَّتْ بِهٰذَا الشَّرْطِ مِنْهُنَّ قَالَ لَهَا قَدْ بَایَعْتُكِ كَلَامًا یُكَلِّمُهَا بِهٖ وَاللّٰهِ مَا مَسَّتْ یَدُهٗ یَدَ امْرَاَةٍ قَطُّ فِی الْمُبَایَعَةِ۔

متفق علیہ مشکوۃ صفحہ ۳۵۴

ترجمہ: حضرت عائشہ رض سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ عورتوں کو بیعت کرتے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انکی پختگی کا امتحان کرنے کیلئے ان ہی باتوں پر عہد لیتے تھے جنکی وہ زمانہ جاہلیت میں عادی تھیں اور اور اس آیت میں اُن باتوں سے انکو منع کیا گیا تھا: یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ

اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ (اے نبی جب آئیں تیرے پاس مسلمان عورتیں بیعت کرنے کو) (پارہ ۲۸ رکوع ۸) توانمیں سے جو عورت ان شرطوں کی پابندی کرنیکا اقرار کرتی تو اس سے آپ فرما دیتے کہ میں نے تجھکو بیعت کر لیا لیکن یہ عہد معاہدہ صرف زبانی گفتگو کے ساتھ ہوتا تھا، خدا کی قسم آپ نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ اپنا ہاتھ کسی عورت کے ہاتھ سے ذرا لگا یا بھی ہو حالانکہ مردوں کو بیعت کرنیکے وقت انکے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر بیعت کرنیکا آپ کا عام دستور تھا)

شرح: موجودہ تحقیق کے مطابق انسان کے جسم میں بجلی کی طاقت موجود ہے اور جب دو آدمی مصافحہ کرتے ہیں تو اس بجلی کے ذریعہ سے ایک دوسرے کے ساتھ اتصال پیدا ہو جاتا ہے اور شاید آنحضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا بیعت کے وقت مردوں کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینا کچھ اس لئے بھی ہو کہ اس اتصال سے بارگاہِ نبوت کے باطنی خصائلِ حمیدہ بیعت کرنے والے میں منتقل ہو جائیں ورنہ کیا یہ شرف ہی کچھ کم ہے کہ کسی شخص کے ہاتھ آپکے دست مبارک کے ساتھ لگ جائیں۔

اب اندازہ فرمائیے کہ عقدِ بیعت کی اہمیت اور آپکے دستِ مبارک کے عظیم شرف کے باوجود آپ نے عورتوں کو صرف کلام کے ذریعہ بیعت کرنا

پسند فرمایا اور یہ گوارا نہ کیا کہ آپ عورتوں کو بھی مردوں کی طرح بیعت فرمالیں۔

حضرت عائشہ رضؓ نے آپ کے اس فعل کو اتنی اہمیت دی ہے کہ اسکو خدا کی قسم کہکر بیان فرمایا ہے، یہ تو اسلام کی پاکیزگی اور نزاہت ہے، اب ہماری موجودہ معاشرت کی طرف نظر کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ انگریزی غلامی کے نتیجہ میں غیر عورت سے مصافحہ کرنا ہماری تہذیب کا ایسا جزء ہے کہ اسکا ترک کرنا گویا ایک بہت بڑی بدتہذیبی ہے، اسی قسم کی وہ جزئیات ہیں جنکا نام اس زمانہ میں تاخر اور قدامت پسندی رکھدیا گیا ہے اور اگر اسکے خلاف آواز اٹھائی جائے تو اسکو یوں سمجھا جاتا ہے کہ گویا یہ تاخر کی ایک دعوت دی جارہی ہے ہمارے معاشرہ میں اسکی مثالیں بہت ہیں کہ ایسی بہت سی چیزیں جو بالکل غیر ضروری ہیں صرف انگریزی تہذیب کی اتباع میں اس طرح داخل ہو چکی ہیں کہ انکے ترک کرنے سے فوراً انگشت نمائی ہونے لگتی ہے۔ یہاں اس شرعی مسئلہ کا تذکرہ کرنا بھی منظور نہیں ہے کہ کسی مرد کا کسی عورت کے عضو کو ہاتھ لگانا جائز ہے یا ناجائز ہے کیونکہ یہ ایک مستقل بحث ہے کہ ایک لڑکے کیلئے بھی اپنی والدہ کے کن کن اعضاء کو چھُونا اور دیکھنا جائز ہے اور کن کن

کونا جائز، یہاں تو صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ جب کوئی معاشرہ
اصولی طور پر فاسد ہو جاتا ہے تو پھر عقول کو اسکے حدود سے
باہر نکلنے میں بے وجہ ضیق اور تنگی محسوس ہونے لگتی ہے اور
یہ ضیق صرف عادت پر مبنی ہوتی ہے نہ کسی فلسفہ پر۔

جو لوگ مسئلہ چھوت کے قائل ہیں ان میں سے بعض روشن
دماغوں سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے اس مسئلہ کو انکے سامنے
رکھا تو انہوں نے مجھکو یہ جواب دیا کہ مسلمان ایک گوشت خور
قوم ہے یہی چھوت ایک ایسی حد ہے کہ اگر ہم اسکو اٹھا دیں تو
پھر جو انکے خصائل ہیں وہ ہم میں سرایت کرنے لگیں گے اسلئے
ان سے تحفظ کا ایک راستہ یہی ہے کہ انکے ہاتھ سے لگی ہوئی
چیزیں کسی برقی اتصال کی وجہ سے ہمارے تبدیلِ خصائل کا
سبب نہ بنیں انسان بھی عجیب فطرت رکھتا ہے کہ جب وہ کسی
چیز کو اختیار کرتا ہے تو وہ اسکی جد و جہد بھی کرتا ہے کہ اپنی علمی
قوت سے اسکو معقول ثابت کرے اور اسطرح دلائل کی طاقت
بہت سی قبیح اشیاء کو مستحسن بنانے میں کامیاب ہو جاتی ہے،
اسلئے مذہب ہی ایک ایسی چھنی چھنائی قطعی حقیقت ہے کہ
اسکو اختیار کر لینے سے بہت سی غلط راہیں خود بخود بند ہو جاتی

ہیں اور محض خود رائی پر چلنے سے بہت سی غلط راہوں میں بھٹکنا پڑتا ہے، آپ اسکو بے وجہ سائنس اور مذہب کے تصادم سے تعبیر کر لیتے ہیں، میرے خیال میں ہم بھی بڑی حد تک چھُوت کے قائل ہو چکے ہیں اور یہ بہت قدیم تہذیب ہمارے اندر بھی سرایت کر چکی ہے اور اسی وجہ سے کسی کا جھوٹا پانی پینا اور جھوٹا کھانا حتیٰ کہ کسی کا بستر یا تولیہ استعمال کرنا یہ سب ہماری جدید معاشرت میں ممنوع ہے، فرق ہے تو اتنا کہ دوسری قوم کا نظریہ یہاں کچھ اور رہا اور ہمارا نظریہ جراثیم کا خوف ہے۔

بیعت کی حقیقت اسلام میں وہ ہے جو آجکل حلفِ وفاداری کی ہوتی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ آج حلف وفاداری صرف وزراء کے طبقہ میں محدود ہے اور اسلام میں اسکا دائرہ ہر ہر مسلمان تک وسیع ہے یعنی ہر مسلمان کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنی حکومت کا آخری حد تک وفادار بنکر رہے اور تنہائی میں بھی سازشیں تیار کرنا تو درکنار اس عہد شکنی کا وسوسہ بھی دل میں نہ لائے، خواہ اسکے لئے اسکو کتنی ہی قربانیاں دینی پڑیں، یہ بات ذرا وضاحت طلب ہے، کہ اسلام میں بیعت کب اور کتنے مقاصد کیلئے لی گئی ہے اور اس شرعی رسم کے لئے آنحضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم

کے دستِ مبارک میں ہاتھ دینا کیوں لازم تھا، اسکو زاہدِ خشک
اور مادہ پرست آزاد کیا سمجھ سکتا ہے، شمع کے جلنے اور پروانہ کی
جاں نثاری کے راز شمع اور پروانہ کے سوا کوئی اور کیا جانے،
ہاں اتنا اشارہ کر دینا کافی ہے کہ آپکے دستِ مبارک میں ہاتھ
دینے سے جو کسی بے علم کو آپ کے ساتھ اتصال نصیب ہو جاتا
ہوگا تو اسکے قلب میں اس ظاہری کنکشن (CONNECTION)
کی وجہ سے نبوت کی بھی (ELECTRICITY) کچھ اس طرح
سرایت کر جاتی ہوگی کہ سالہا سال کے کفر کے جراثیم اور اُن کے
مُہلک اثرات آن کی آن میں جلکر خاکستر بن جاتے ہوں گے،
اگرچہ یہاں روئے انور کا ایمان اور عقیدت کے ساتھ ایک
ذرا سا نظارہ بھی کافی تھا لیکن اس کنکشن (CONNECTION)
کے بعد نہ معلوم نبوت کے برکات اور انوار ایک ادنیٰ شخص کو
کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہوں گے، شاید کوئی دَور آجائے
کہ مسلمانوں میں اس راز کے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے،
لیکن راز جو بھی ہو پھر بھی خاص عورتوں کے حق میں سب سے
عظیم معصوم اور سب سے برتر رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے
یہ گوارا نہ کیا کہ اس عظیم عہد کے وقت بھی اپنے دستِ مبارک سے

عورتوں کا ہاتھ چھوئیں، اب اگر آپ عورتوں کے ساتھ شیک ہینڈ (SHAKE HAND) کرنا ترقی اور بابرکت سمجھتے ہیں تو یہ آپ جانیں۔

مسئلہ تعدّد ازدواج میں اگر اسکی ذیلی دفعات پر بھی نظر رکھی جائے تو اس سے بڑھکر کوئی اور متوازن قانون نہیں ہو سکتا

(۴۷) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضؓ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا کَانَتْ عِنْدَ الرَّجُلِ امْرَأَتَانِ فَلَمْ یَعْدِلْ بَیْنَهُمَا جَاءَ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَشِقُّهُ سَاقِطٌ۔ رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی وابن ماجۃ والدارمی صفحہ ۲۷۹

ترجمہ: ابوہریرہؓ رسول اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا اگر کسی شخص کی دو بیویاں ہوں اور وہ انکے درمیان قانونِ شرعی کے مطابق عدل کی دفعات کو پورا پورا ادا نہ کرے تو قیامت کے دن اسطرح آئیگا کہ اسکے جسم کا ایک پہلو فالج زدہ شخص کی طرح جھکا ہوا ہوگا (گویا دنیا میں ایک بیوی کی طرف میلان کی مخفی تصویر محشر میں اس طرح مجسم ہو کر اہلِ محشر کے سامنے نمایاں ہوگی)

(۴۸) عَنْ عَائِشَةَ رضؓ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ کَانَ یَقْسِمُ بَیْنَ نِسَائِهٖ فَیَعْدِلُ وَیَقُوْلُ اَللّٰهُمَّ هٰذَا قَسْمِیْ

فِیْمَا اَمْلِکُ فَلَا تَلُمْنِیْ فِیْمَا تَمْلِکُ وَلَا اَمْلِکُ۔

رواہ الترمذی وابوداؤد والنسائی وابن ماجہ والدارمی مشکوٰۃ صفحہ ۲۷۹

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتی ہیں کہ آپ کی عادتِ مبارکہ یہ تھی کہ آپ اپنی بیبیوں کے درمیان عدل کے قانونی دفعات کی پوری پوری رعایت رکھنے کے باوجود اپنے رب کے سامنے معذرت کے یہ کلمات فرمایا کرتے کہ الٰہی بیویوں کے درمیان دفعاتِ عدل کو اپنی مقدور بھر جہاں تک میں پورا کر سکتا ہوں وہ تیرے سامنے ہے اور جو میری مقدور سے باہر ہیں اور تو ان کا مالک ہے اگر اس میں مجھ سے کچھ تقصیر ہو اسکا مواخذہ مجھ سے نہ فرمانا۔

شرح: ہمارے موجودہ زمانہ میں کفر کی معاشرت کے غلبہ نے بہت سے سلجھے ہوئے مسائل میں بے وجہ پیچیدگی پیدا کر دی ہے ان میں سے ایک مسئلہ تعدد ازدواج کا بھی ہے، اصولی طور پر میرے لئے یہاں یہ بیان کرنا ضروری تھا کہ جدید شرائع سماویہ کا نزول کن کن اسرار اور حِکَم پر مبنی ہوتا ہے لیکن اگر اس موضوع کو چھیڑا جاتا ہے تو بات بہت طویل ہو جاتی ہے اسلئے مختصراً یہ لکھا جاتا ہے کہ جو شریعت عالمگیر شریعت ہے اسکی نظر بھی اتنی ہی وسیع ہونی لازم تھی ظاہر ہے کہ طبقاتِ انسانی

آب وہوا اور ملک کے اختلاف سے مختلف قسم کی طاقتوں میں بڑا تفاوت رکھتے ہیں حتیٰ کہ اس اختلاف کی وجہ سے انسانوں کی عمروں میں بھی بہت بڑا اختلاف پایا جاتا ہے، جو اصحاب انسانی حیات وموت کے اعداد و شمار پر نظر رکھتے ہیں وہ اس سے بخوبی آشنا ہیں، اسی طرح ایک ملک کے اندر بھی ایک ہی طبقہ کے انسانوں میں بہت کچھ اختلاف نظر آتا ہے، ایک طبقہ ہے جسکی خوراک بہت کم اور اعضاء کمزور اور اسی ملک میں بلکہ اسی شہر کے بالکل قریب آبادی میں دوسرا طبقہ ایسا نظر آتا ہے جسکی غذا اور جسمانی اعضاء کی جسامت میں اتنا تفاوت نظر آتا ہے گویا وہ دو ملک کے باشندے ہیں، ایک جامع شریعت کیلئے یہ ضروری تھا کہ ان ضروریات کے ساتھ ساتھ وہ انسانوں کے مختلف طبقات کیلئے بھی پوری پوری رعایت رکھے، مگر مصلحتِ قانونی اسکی متقاضی تھی کہ قانونی شکل میں مساوات رکھی جائے تاکہ دماغوں میں بے وجہ سوال وجواب کا الجھاؤ پیدا نہ ہو البتہ ذیلی دفعات ایسی مقرر کر دی جائیں کہ جنمیں ان تمام اختلافات کی رعایت ملحوظ رہے، دراصل اگرچہ یہ قانون ایک طرف وسیع نظر آتا ہے تو دوسری طرف اپنی دفعات کے لحاظ سے اتنا محدود ہے کہ

ایک ذمہ دار شخص کیلئے ان وسعتوں سے فائدہ اٹھانا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے، اس مختصر تمہید کے بعد آپ اسلام میں تعداد ازدواج کے مسئلہ پر غور فرمایئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اگر ایک طرف اسمیں کچھ وسعت رکھی گئی ہے تو وہ طبقاتِ انسانیہ کا لحاظ رکھتے ہوئے ناگزیر تھی، لیکن دوسری طرف اسمیں اتنی تنگی کر دی گئی ہے کہ اگر ایک ضرورتمند بشرطیکہ وہ خدا کا خوف دل میں رکھتا ہو اس سے فائدہ اٹھانا چاہے تو مشکل سے اٹھا سکتا ہے اسی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رہے کہ ازدواجی زندگی کے مقرر کردہ اعداد کے بعد بھی اگر کوئی شخص مقرر کردہ حدود سے ناجائز طور پر تجاوز کر جائے تو پھر اسکی سزا پر غور کر لینا بھی ضروری ہے، شریعت نے اسکی سزا سنگساری مقرر کی ہے، جب سزا اتنی شدید مقرر کی گئی تو دوسری طرف لازم ٹھیرا کہ اصل قانون کے اندر اتنی لچک رکھی جائے کہ ایک ضرورتمند شخص اس قانون سے فائدہ اٹھا کر اپنے نفس کو اس سزا سے محفوظ رکھ سکے، دوسرے آئین میں ایک طرف بہ لحاظ عدد اگرچہ بہت تنگی رکھی گئی ہے لیکن دوسرے عنوانات سے اتنی توسیع کر دی گئی ہے کہ ایک شخص کو آئینی طور پر بھی ایک محدود مدت کیلئے بہت سی عورتوں سے استفادہ کا

حق دیا گیا ہے، بعض آئین میں اگر یہ آزادی نہیں ہو تو اسکے ساتھ رضا اور
جبر کا فرق قائم رکھا گیا ہو۔ رضا کو تو جرم کی تعریف میں داخل نہیں کیا گیا،
البتہ جبر کو جرم کی تعریف میں داخل کیا گیا ہو پھر جو اسکی سزا مقرر کی گئی ہو وہ
وہ اتنی خفیف ہو کہ کسی بے عقل اور نافہم انسان کو اپنی مقرر کردہ حدود سے،
تجاوز کرنے میں زیادہ پس و پیش کی ضرورت باقی نہیں رہتی جو اپنی خواہشات
کو بڑی دور تک آزادی سے پورا کرنیکے مجاز ہوں وہ اس قید و بند کے اسرار و حِکَم
سے کیا آشنا ہو سکتے ہیں، اگر یہ بات آپکی سمجھ میں آجائے تو یہ مسئلہ
بھی خود بخود حل ہو جاتا ہے کہ انسان جو اشرف المخلوقات ہے
اس کی معاشرتی زندگی کی پاکیزگی قائم رکھنے کے لئے اس
جرم کی سزا شریعت نے سنگساری کیوں مقرر کی ہے، بہ الفاظ دیگر
اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک طرف قانون میں شروع ہی سے
وسعت رکھی گئی ہے تو پھر ایسے جرم کا ارتکاب اگر ہوا تو کیوں
ہوا، اس لئے اسکو نظر اندازی کے قابل نہیں سمجھا گیا۔

اس وقت میں اسلامی حدود کے متعلق بحث کرنا نہیں
چاہتا، اس پر مستقل تصانیف علماء لکھ چکے ہیں، یہ تذکرہ ضمناً
صرف اسلئے کیا گیا ہے کہ جن حِکَم اور اسرار کی بناء پر کسی غیر شریفانہ
فعل کی سزا اتنی سخت مقرر کر دی جائے تو پھر دوسری طرف

اسکو قانون میں کچھ نہ کچھ وسعت دینا عقل اور انصاف کا تقاضا ہونا چاہیئے، شریعتِ اسلامیہ نے اس مسئلہ کی اتنی اہمیت محسوس کی ہے کہ خود قرآن کریم نے اسکو اپنے الفاظ میں اس انداز میں بیان کیا ہے کہ جسکے بعد آپ خود غور کرلیں کہ اس وسعت سے فائدہ اٹھانا کسی دیندار انسان کے لئے کتنا مشکل ہے اب آیتِ ذیل کو ملاحظہ فرمائیے: وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ وَإِنْ تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا (اور تم ہرگز برابر نہ رکھ سکو گے عورتوں کو اگرچہ اسکی حرص کرو سو بالکل پھر بھی نہ جاؤ کہ ڈال رکھو ایک عورت کو جیسے ادھر میں لٹکتی اور اگر اصلاح کرتے رہو تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے) (پارہ ۵ رکوع ۱۶)

آیتِ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ نکاح کے بارے میں جو وسعت دی گئی ہے وہ اسی شرط کے ساتھ دی گئی ہے کہ جملہ معاملات میں بیویوں کے درمیان مساوات کا برتاؤ قائم رکھا جائے اور نئی اور پرانی کا بھی کوئی فرق نہ کیا جائے اور یہ ایسی ٹیڑھی کھیر ہے کہ تمہاری کوشش کے باوجود اس کا پورا ہونا مشکل ہے بلکہ تاکیدی لفظ میں یوں فرمایا ہے کہ تمہارے بس سے باہر ہے

کیونکہ انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ ان نازک تعلقات میں ایک طرف ڈھل کر رہتا ہے اگرچہ وہ شرعی حدود کو قائم بھی رکھنا چاہیئے، لیکن اگر کوئی باہمت ایسا نکل بھی آئے تو پھر یہ قانون اتنی نزاکت رکھتا ہے کہ ان دفعات کو پورا کرنے کے بعد بھی اپنے قصور اور لغزش سے ڈرتے رہنا چاہیئے اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ اس نازک مرحلہ میں باہم آشتی اور خدا کا خوف دل میں رکھنے کے باوجود ایک مسلمان کی نظر خدا کی رحمت اور مغفرت پر لگی رہنی چاہیئے، یہی وجہ تھی کہ حدیثِ بالا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیبیوں میں پورا پورا عدل قائم رکھنے کے بعد بھی پروردگارِ عالم کی جناب میں بصد عجز وانکسار یہ عرض کیا کرتے تھے کہ الٰہی جو میری طاقت ہے وہ میں ادا کر لیتا ہوں لیکن کبھی کبھی کسی کی تمیز اور لیاقت اور فہم و فراست کی بناء پر انسانی قلب غیر اختیاری طور پر اسکی طرف زائد مائل ہو جاتا ہے تو اگر ایسا ہو تو اس غیر اختیاری میلان کا بھی مجھ سے مواخذہ مت فرمانا۔

آیتِ مذکورہ میں لفظ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ میں شوہر کی انسانیت سے یہ اپیل کی گئی ہے کہ یہ بھی کیا انصاف

اور انسانیت ہے کہ ایک عورت کو اپنی قید میں ڈال کر نہ تو اسکے حقوق پورے پورے ادا کرے اور نہ اسکو علیحدہ کر دے کہ وہ اپنی زندگی کے ایام شرعی حدود میں کسی دوسرے کے ساتھ راحت سے بسر کر سکے۔

اب سوچئے کہ نیک لوگ اور آزاد طبائع دونوں کی رعایت رکھ کر یہ قانون اور یہ وسعت کتنی قرینِ عقل ہے، یہ معلوم ہے کہ دنیا ہمیشہ نیک لوگوں سے آباد نہیں رہیگی اسمیں آزاد منش افراد بھی ہونگے جو حدودِ شریعت سے تجاوز کئے بغیر نہیں رہ سکتے تو اصل قانون میں اگر بہت تنگی کر دیجائے تو کیا یہ صرف یکطرفہ نظر نہیں ہے اور کیا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اتنی بڑی سخت سزا کا نفاذ حکومتِ اسلامیہ کو مجبوراً عام طور پر کرنا پڑ جائے، اس مسئلہ پر مجھ سے پہلے بہتیرے اہلِ قلم تفصیلی تبصرہ کر چکے ہیں اسلئے میں نے مختصراً چند سطور لکھدی ہیں اب جو طبائع الٰہی قانون کی پرواہ نہ کریں ان کو انسانی قوانین کی پابندی کچھ فائدہ نہیں دے سکتی، رہا توالد اور تناسل کا مسئلہ سو اس کا تعلق تعدد ازدواج کے مسئلہ سے بہت کم ہے، اول تو بہ لحاظ مردم شماری تعددِ ازدواج کے معاملات ہیں کتنے اور پھر یہ معلوم ہے

بسااوقات جسکے مقدر میں اولاد ہوتی ہے ایک عورت سے بھی
بہت ہو جاتی ہے اور بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ چند شادیوں
کے بعد بھی اولاد نہیں ہوتی اسلئے اسکو فیصلہ کُن نہیں سمجھنا چاہیئے [۱]

---

[۱] رموز قدرت کا بھلا کون احاطہ کرسکتا ہے لیکن جو بات آنکھوں سے
سب کو نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہماری عام ضروریات کی خود قدرت
متکفل بنی ہوئی ہے بلکہ معلوم یوں ہوتا ہے کہ انسانی حیات کے لئے
جو شئے جتنی اہم ہے قدرت نے اسکو اتنا ہی ارزاں اور بے قیمت بنا رکھا ہے
مثلاً ایک ہوا ہی کو دیکھ لیجئے کہ ہمارے لئے وہ کتنی ضروری ہے پھر وہ
کتنی بے قیمت ہے اسکے بعد درجہ بدرجہ دوسری اشیاء کو قیاس کرتے چلے
جایئے، عرب کے بے آب وگیاہ ملک میں لاکھوں حاجی آتے ہیں بعض
سالوں میں حجاج کی تعداد دس لاکھ سے بھی تجاوز کر گئی ہے اور کم ازکم
منیٰ میں دولاکھ جانوروں سے کم کبھی ذبح نہیں ہوتے اور یوں بھی چار
پانچ ماہ تک گوشت کے مصارف بے اندازہ رہتے ہیں مگر یاد نہیں
آتا کہ کبھی جانوروں میں کمی واقع ہوئی ہو یا گوشت کے نرخ میں کوئی
زیادتی، دوسری اشیاء کیلئے تو آپ سائنس کے زور سے کچھ نہ کچھ اسباب
تراش ہی لینگے مگر پانی کے متعلق کیا فرمائیں گے وہ تو نہ روس سے آتا
ہے نہ امریکہ سے پھر جس ملک میں یہ اژدحام ہوتا ہے وہاں نہ کوئی دریا
ہے نہ کوئی نہر۔

اس کو بھی جانے دیجئے تقسیم ہند کے بعد یہ بات بہت قرین قیاس
ہوسکتی تھی کہ غریب مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد دوسری طرف منتقل
ہوجانیکے بعد جانوروں کی اتنی کثرت ہوجائے گی کہ شاید انکے بسنے کیلئے

باقی حاشیہ برصفحہ ۲۴۲

اسی کے ساتھ یہ بھی پیشِ نظر رکھنا چاہئے کہ ایک طرف عاشقانہ تصانیف کی کثرت، فحش ناولوں کی اشاعت، عُریاں تصاویر اور گندے سینما اور طرح طرح کی نشہ آور چیزوں کی اجازت ہو اور دوسری طرف دین میں یہ اصلاح کیجائے کہ ایک مرد کا تعلق صرف ایک ہی عورت کے ساتھ محدود کردیا جائے تو ان دو متضاد قوانین کا جمع کرنا کہاں تک قابلِ عمل ہو سکتا ہے، اور اگر ہو بھی سکتا ہے تو کتنے محدود طبقہ کیلئے اور اگر بالفرض اس کی عمومیت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو اسکے لئے کتنی مدّت درکار ہوگی اور اس مدت میں اسلامی معاشرہ کتنا برباد ہو چکا ہوگا، جس پاکیزگی کا دعوٰی کرنیوالے دعوٰی کرتے ہیں اور نظر اور قلب میں کوہِ ہمالیہ کے حائل ہونے کا خیالِ خام جمائے بیٹھے

بقیہ مضمون صفحہ ۲۴۱:- بھی کوئی جگہ باقی نہ رہیگی اور دودھ اور گھی کی تو شاید ندیاں بہہ نکلیں گی مگر واقعہ یہ ہے کہ جب یہ مسلمان مشترکہ ہند میں رہتے تھے تو جانوروں کے احترام کرنیوالے مسلمان شکاریوں کی بڑی خوشامد کیا کرتے تھے کہ وہ کسی طرح ان پر بے رحمی کر کے انسانوں پر رحم کھائیں تاکہ ان کی کھیتیاں برباد نہ ہوں۔

ان حقائق پر نظر کرنے سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر انسانوں کی تعداد کتنی بھی ترقی کیوں نہ کر جائے لیکن قدرت یقیناً انکو بھوکا نہیں مرنے دیگی۔ ہم خود ہی مفت میں اس خوف سے مرے جاتے ہیں۔

ہیں میں اسکے متعلق بھی کچھ لکھتا لیکن ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز

ورنہ در مجلسِ رنداں خبرے نیست کہ نیست

قومی انحطاط کی انتہا یہ ہے کہ وہ دوسری اقوام کی بدنما معاشرت اختیار کرنے میں اپنا فخر محسوس کرنے لگے

(۴۹) عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِنِ الْخُدْرِیِّ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّے اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لَتَتَّبِعُنَّ سُنَنَ مَنْ قَبْلَکُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ وَ ذِرَاعًا بِذِرَاعٍ حَتّٰی لَوْ دَخَلُوْا جُحْرَ ضَبٍّ تَبِعْتُمُوْھُمْ قُلْنَا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ آلْیَھُوْدُ وَالنَّصَارٰی قَالَ فَمَنْ بخاری صفحہ ۱۰۸۸

وَعِنْدَ التِّرْمِذِیِّ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرٍو قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّے اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَیَاْتِیَنَّ عَلٰی اُمَّتِیْ کَمَا اَتٰی عَلٰے بَنِیْ اِسْرَآءِیْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ حَتّٰی اِنْ کَانَ مِنْھُمْ مَنْ اَتٰی اُمَّہٗ عَلَانِیَۃً لَکَانَ فِیْ اُمَّتِیْ مَنْ یَّصْنَعُ ذٰلِکَ ۔ مشکوٰۃ صفحہ ۳۰

ترجمہ: ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ تم اپنے سے پہلی امتوں کے طریقوں

کی ہو بہو پوری پوری نقلیں ضرور اتار کر رہو گے، یہاں تک کہ اگر بالفرض ان میں کوئی شخص گوہ جیسے ذلیل جانور کے تنگ سوراخ میں گھسا ہوگا تو تم بھی اس میں ضرور گھس کر رہو گے، ہم نے عرض کی یا رسول اللہ کیا پہلی امتوں سے آپ کی مراد یہود اور نصاریٰ ہیں۔ آپ نے فرمایا تو پھر اور کون مراد ہوتے۔ (بخاری شریف)

ترمذی کی روایت میں اس اندھی اور بیہودہ تقلید کی تفصیل عبداللہ بن عمروؓ صحابی سے ان الفاظ میں منقول ہے کہ اگر ان امتوں میں سے کوئی ایسا ناہنجار بے حیا گزرا ہوگا جسنے اپنی ماں کے ساتھ بُرا فعل کیا ہو تو میری امت میں بھی کوئی شخص ایسا ہوگا جو یہ بدتر عمل کر کے رہے گا۔

شرح: ادیانِ سماویہ میں نسخ ایک مسلّم مسئلہ ہے اگرچہ بے علم طبقہ کتنا ہی اس کا انکار کرتا رہے اور یہ آج بھی مسلّم ہے کہ جب کوئی قانون منسوخ ہو جاتا ہے تو اس کا مفہوم یہی ہے کہ اب وہ قابلِ عمل نہیں رہا اگر اسکے بعد بھی اسپر کوئی عمل کرتا ہے تو یہ اسکی جہالت کا ثبوت ہوتا ہے جب اسلام دنیا میں آیا تو اس نے زمانہ کے ارتقا کے مطابق بہت سے وہ فروعی قانون منسوخ کر دیئے جو اسکے دور میں غیر مفید تھے اور اس نسخ کا مطلب

صرف ایک علمی تبدیلی نہ تھا بلکہ عملی ترمیم تھی اب اگر جدید قوانین
کے بعد بھی کوئی شخص ان منسوخ شدہ قوانین پر عمل کرتا ہے
تو اسکا مطلب دوسرے الفاظ میں یہی نکل سکتا ہے کہ وہ جدید
مجوزہ قوانین کو تسلیم ہی نہیں کرتا اور ظاہر ہے کہ یہ بہت بڑا
جرم ہے، اسی لئے اسلام کے ابتدائی دور میں آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم نے مسلمانوں کو توریت اور انجیل کے مشغلہ سے شدت
کے ساتھ منع فرمایا تھا اور اسی طرح اسلامی قوانین میں جن جن
قوانین کی حدود کہیں قدیم قوانین کے ساتھ ملتی جلتی تھیں،
وہاں بڑی اہمیت کے ساتھ اپنے حدود کے تحفظ کی تاکید
فرمائی تھی اور جس طرح ممالک میں اپنے اپنے حدود کے تحفظ کا
مسئلہ بڑی اہمیت رکھتا ہے اس سے کہیں زیادہ اسلام میں
شرعی حدود کے تحفظ کا مسئلہ اہمیت رکھتا ہے لیکن جن کی
نظروں میں اپنے ملک کی ایک ایک انچ زمین کی قدر و قیمت ہو
افسوس ہے کہ آج انکے نزدیک اپنی شریعت اسلام کی وسیع
مملکت میں بڑے سے بڑے میدانوں کو بھی چھوڑ دینے کا
نام ترقی اور بلند حوصلگی ہے اور اسکے برخلاف ان حدود کے
تحفظ کا نام تنگ نظری اور تعصب ہے یا اس کو رجعت پسندی

سے تعبیر کیا جاتا ہے اگر انصاف سے دیکھا جائے تو رجعت پسندی اور تاخر تو اس کا نام ہونا چاہئے کہ ہم ان شریعت والوں کی اتباع کریں جو ہم سے سینکڑوں سال پہلے کے ہیں نہ یہ کہ ہم اس شریعت پر عمل کریں کہ جو ہماری تقدمی شریعت ہے یعنی اسلام۔

لیکن جب قومی ادبار آتا ہے تو وہ سب سے پہلے قوم کے افراد میں ایک عظیم ذہنی انقلاب پیدا کر دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ نکلکر رہتا ہے کہ وہ اپنی اساسِ حیات کو خود اپنے آپ اپنے ہاتھوں اکھیڑنا شروع کر دیتی ہے اور اسکے بعد جو تعمیر اس پر بنائی گئی تھی وہ خود بخود بڑی آسانی سے گر پڑتی ہے تو پھر اسکے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہتا کہ اپنی زندگی گذارنے کیلئے غیروں کے گھروں کو تکا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے اس انقلاب کی بڑی حسرت کے انداز میں پیشگوئی فرمائی ہے کہ ایک دن وہ ضرور آنا ہے کہ تم اپنا مرکز چھوڑ کر اپنے حریفوں کی دُموں کے پیچھے پیچھے پھرنے لگو گے، کاش کہ اگر یہ تقلید انکے اوصافِ حمیدہ میں ہوتی تو بھی چلئے اسکا گلہ نہ تھا مگر حسرت تو یہ ہے کہ

یہ انکے ان عیوب تک سرایت کر جائیگی جو اسلام کیلئے نہیں بلکہ
انسانیت کیلئے بھی بد تر سے بد تر داغ ہی قوم میں جب یہ انقلاب رُونما
ہوتا ہے تو اسطرح آہستہ آہستہ رونما ہوتا ہے کہ وہ افراد جن
میں اسکا شعور رہتا ہے وہ کچھ تو اٹھتے جاتے ہیں اور جو باقی
بچتے ہیں وہ رفتہ رفتہ اس سے متأثر ہوتے رہتے ہیں، یہانتک
کہ اس جدید نسل کو یہ احساس ہی باقی نہیں رہتا کہ ہم کل کہاں
تھے اور آج کہاں جا پہنچے، اور اسکے اسباب بھی ایک سے ایک
عجیب پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا
سے روایت ہے وہ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کو فرماتے خود سنا ہے کہ جو حرام چیز اسلام میں سب سے پہلے حلال کی
جائیگی وہ شراب ہوگی، اس پر کسی نے آپ سے پوچھا یا رسول اللہ
یہ کیسے ہوگا حالانکہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اسکی حرمت
صاف صاف الفاظ میں بیان فرمادی ہے، آپ نے فرمایا کہ یہ
اسطرح ہوگا کہ لوگ اسکا نام بدلکر دوسرا نام رکھ لینگے (اور اس
حیلہ سے اسکو حلال بناکر استعمال کرینگے۔ افسوس ہے کہ اب تو
اس حیلہ کی بھی ضرورت باقی نہیں ہے) (مسند دارمی مشکوٰۃ شریف صفحہ ۴۶۰)
حدیثِ بالا سے معلوم ہوا کہ جب قوم بگڑتی ہے تو اسکے اسباب

میں سے ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ عیب اسکی نظر میں عیب ہی نہیں رہتا بلکہ ہنر نظر آنے لگتا ہے اور اسکے لئے وہ طرح طرح کے حیلے تراشنے لگتی ہے، پھر جب آنکھیں عیب کو ہنر دیکھنے لگیں تو یہ ایسا مہلک انقلاب ہوتا ہے کہ اسکے سنورنے کی امید بھی منقطع ہو جاتی ہے، حیرت ہے کہ آج دنیا نے اتباعِ سنت کا نام اندھی تقلید رکھ لیا ہے وَالعَیَاذُ بِاللّٰہ حالانکہ اندھی تقلید یہ ہے کہ جو ہمارے کھلے دشمن ہیں ہم ناپ ناپ کر ایک ایک بالشت انکے قدم بقدم چلنے میں اپنا فخر محسوس کرنے لگیں اور اپنی اسلامی معاشرت پر قائم رہنا اور دوسروں کی غلط معاشرت سے متنفر رہنے کا نام تعصب رکھا جائے۔

حدیث کی روشنی میں مذموم عصبیت وہ ہے جو حضرت فسیلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اپنے والد ماجد سے روایت کرتی ہیں کہ میں نے اپنے والد کو یہ فرماتے خود سنا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یا رسول اللہ اگر ایک شخص اپنی قوم سے محبت رکھتا ہے تو کیا یہ بھی تعصب میں داخل ہے۔ آپ نے فرمایا نہیں بلکہ تعصب یہ ہے کہ اپنی قوم کوئی ظالمانہ قدم اٹھائے تو اسمیں بھی قوم ہی کا ساتھ دیا جائے اور اسکی مدد کی جائے

(مسند احمد، مشکوٰۃ شریف صفحہ ۴۱۸)

اس حدیث سے اجمالاً مذموم تعصب کی حقیقت سمجھی جا سکتی ہے، دوسری اقوام کی اتباع طعام و شراب، لباس کی وضع اور قطع میں تو بڑی بات ہے اسلام نے تو اپنی ملکی صنعت کو دوسری ملکی صنعتوں پر بھی اتنی ترجیح دی ہے کہ اگر اپنی ملکی صنعت سے کام چل سکتا ہے تو اسی کو اختیار کرنا چاہیئے، حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک میں ایک عربی کمان تھی، آپکی نظر ایک ایسے شخص پر پڑی کہ جسکے ہاتھ میں حسب الاتفاق پارسی ساخت کی کمان تھی، آپ نے اس سے مخاطب ہو کر فرمایا تیرے ہاتھ میں یہ کیا ہے اسکو پھینک دو اور اپنی کمان کیطرف اشارہ فرمایا کہ ہمیشہ تم لوگ ایسی کمان کو استعمال کیا کرو" اور ان میں جنگی اسپرٹ پیدا کرنیکے لئے فرمایا" کہ سیدھے سیدھے سخت نیزے جو جنگ میں بہت کار آمد ہوتے ہیں انکی مشاقی جاری رکھو کیونکہ ان ذرائع سے اللہ تعالیٰ دین کی بلندی میں تمہاری تائید فرمائیگا اور اپنے ملک میں تمکو اطمینان کیساتھ بیٹھنا نصیب فرمائیگا۔ (ابن ماجہ، مشکوٰۃ ص ۳۳۸)

ایک اور حدیث میں ہے جسکو ابو عقبہ رضؓ روایت کرتے ہیں، یہ ابو عقبہ اہلِ فارس کے آزاد کردہ غلام تھے، کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جنگ اُحد میں شریک تھا تو میں نے مشرکین

یں سے ایک شخص پر تلوار کا وار کیا اور کہا کہ میں ہوں ایک فارسی نوجوان، لے یہ وار میری جانب سے لیتا جا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری طرف دیکھا اور فرمایا کہ واہ یہ کیا بات کہی، یہ کہنا چاہیئے تھا کہ لے مجھ سے لیتا جا اور میں ہوں ایک انصاری نوجوان۔ (ابو داؤد مشکوٰۃ صہ ۴۱۸)

عرب میں نسبت کے بہت سے طریقے تھے، ان میں سے ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ جو شخص کسی قبیلہ کا آزاد کردہ غلام ہوتا وہ اپنے آپ کو انکی طرف نسبت کر دیا کرتا تھا اور اسی نسبت کے لحاظ سے انہوں نے اپنے آپ کو فارسی نوجوان کہا تھا، عُرف اور استعمال کے لحاظ سے اگرچہ یہ نسبت صحیح تھی لیکن اسپر بھی آنحضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ پسند نہ آیا کہ جب یہ انصار میں سے تھے تو پھر انہوں نے اپنی اس اسلامی نسبت کو جنگ کے موقع پر کیوں ترجیح نہ دی ہمیں نے اس موقع پر ان احادیث کو اسلئے پیش کیا ہے کہ آپ یہ محسوس کر سکیں کہ کتنی چھوٹی چھوٹی چیزوں میں اسلامی نام و نسبت تک کی رعایت کیجاتی تھی تو پھر بڑی باتوں کا اس سے خود اندازہ کر لینا چاہیئے اور اسی سے یہ بھی اندازہ کر لینا چاہیئے کہ اپنی معاشرت کو کلیتہً چھوڑ کر دوسروں کی نہیں بلکہ دشمنوں کی معاشرت میں ڈوب جانا یہ اسلامی نظر میں کتنا مکروہ فعل ہوگا اور سیاسی لحاظ سے بھی اس کا نام

قومی موت ہے، خواہ اس کا نام آپ تعصب رکھیں یا کچھ اور۔

مقدمہ ابن خلدون اٹھا کر دیکھئے تو آپکو معلوم ہوگا کہ کسی قوم کی زندگی کے لئے عصبیت کتنی اہم ہے، اسلام نے آکر اس حقیقت کی تردید نہیں کی بلکہ اسکو اور مضبوط اور مستحکم بنایا ہے البتہ اسکی اصلاح یہ کی ہے کہ اپنی حیات اور بقا کیلئے جو صحیح تعصب کر سکتے ہیں وہ ضرور قائم رکھیں لیکن ظلم پر اپنی قوم کا ساتھ نہ دیں اور اس پر اسکی امداد کرنے سے سخت احتراز کریں کیونکہ یہ تعصب اسلام کی نظر میں مذموم ہے۔

پھر یہ اندھیر نہیں تو اور کیا ہے کہ آپ اپنے دشمنوں کی ایک ایک ادا کو اختیار کرنا پسند کرتے ہیں اور اس کا نام آجکل کی اصطلاح میں "تقدم" رکھ لیتے ہیں اور اسلام کے اہم سے اہم مصالح اور پُر اسرار امور کے اختیار کرنے کا نام "تأخر" رکھتے ہیں، جہاں تک میں نے غور کیا مجھ کو تو یہی ثابت ہوتا رہا ہے کہ تقدم اور ترقی کا جو مفہوم آپ کے دماغوں میں بدقسمتی سے بیٹھ چکا ہے وہ صرف یہ ہے کہ سب سے پہلے پردہ توڑ ڈالا جائے، اجنبی مرد اور عورتوں کے اختلاط میں کوئی روک ٹوک باقی نہ رہے پورے تزئین کے ساتھ عریاں لباس میں آزادانہ پھرنے کی عورتوں کو عام اجازت ہو، سینما دیکھنا کوئی عیب

شمار نہ رہے، رقص اور شراب وکباب، گانا و بجانا یہ تمام فیشن
ہو جائے غرضیکہ دشمنوں کی جتنی حیا سوز حرکات ہیں وہ سب
اپنالی جائیں اور اسکے خلاف اگر کوئی عمل بھی ہو تو بس اسکا نام
"تأخر" رکھ لیا جائے ورنہ آپ بتائیں کہ آج انگریزی زبان کی
تعلیم میں آپنے کتنی ٹھوس ترقی کی ہے۔ میرے تجربہ میں تو آجکل کا بی۔اے
(B. A.) پہلے میٹرک کے برابر بھی استعداد نہیں رکھتا اور پھر یہ
سوچیئے کہ انکی زندگی میں سے آپ نے صرف امورِ مذکورۂ بالا کو ہی
چنکر پسند کر لیا ہے یا انکے احساسِ ذمہ داری، فرض شناسی یا وقت
کی پابندی اور نمائشی دیانتداری اور راست گوئی حقیقی تعصب
یعنی اپنی قوم کے نفع کی خاطر دوسروں کی زندگی کی کوئی قیمت نہ
پہچاننا اور اپنی اغراض پر دوسروں کو بیدردی سے قربان کر دینا اور
اپنی عزت کے لئے دوسروں کو اتنا ذلیل سمجھنا کہ اپنی مجالس اور
اپنے سفر و حضر کے مقامات میں انکے لئے علیحدہ انتظامات محفوظ
کر لینا وغیرہ وغیرہ میں بھی آپ نے کسی ایک صفت کو اختیار کیا

خلاصہ یہ ہے کہ ہم نے جو تقلید بھی کی ہے وہ صرف انکے
عیوب میں کی ہے اور اسی کا نام "تقدم" رکھا ہے ورنہ آپ ہی انصاف
کریں کہ فنونِ جدیدا ور صنائع جدیدہ اور سائنس جدید سے جو

فوائد حاصل ہو سکتے ہیں وہ تو بہت دُور کی باتیں ہیں، ابھی تو ہم کو انکی سی ڈبل روٹی اور بسکٹ بنانے بھی نہیں آتے اور زیادہ افسوس تو اس کا ہے کہ ابھی تک ہماری توجہات بھی ان خامیوں کی طرف نہیں گئیں ہماری جماعتی اور انفرادی مساعی صرف اپنے ذاتی منافع پر لگی ہوئی ہیں اگرچہ ہمارا قومی شیرازہ کا ایک ایک تار بھی کیوں نہ بکھر جائے کیا میں اسکا نام "تقدم" رکھوں کیا میں اس بے تعصبی کو عزت کی نظر سے دیکھوں، کیا میں اس اندھی تقلید کی تعریف کروں اُسکی امیدیں آپ مجھ سے تو منقطع کرلیں۔

عالمِ برزخ کا ایک عجیب منظر یعنی مغفرت بھی ہو جائے اور سزا بھی بھگتنی پڑے

(۵۰) عَنْ جَابِرٍؓ اَنَّ الطُّفَيْلَ بْنَ عَمْرِو نِ الدَّوْسِيَّ لَمَّا هَاجَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَى الْمَدِيْنَةِ هَاجَرَ اِلَيْهِ وَهَاجَرَ مَعَهُ رَجُلٌ مِّنْ قَوْمِهٖ فَمَرِضَ فَجَزِعَ فَاَخَذَ مَشَاقِصَ لَهٗ فَقَطَعَ بِهَا بَرَاجِمَهٗ فَشَخَبَتْ يَدَاهُ حَتّٰى مَاتَ فَرَاٰهُ الطُّفَيْلُ بْنُ عَمْرٍو فِيْ مَنَامِهٖ وَهَيْئَتُهٗ حَسَنَةٌ وَّرَاٰهُ مُغَطِّيًا يَدَيْهِ فَقَالَ لَهٗ مَا صَنَعَ بِكَ رَبُّكَ فَقَالَ غَفَرَ لِيْ بِهِجْرَتِيْ اِلٰى نَبِيِّهٖ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَالِيْ أَرَاكَ مُغَطِّيًا يَدَيْكَ قَالَ قِيْلَ لِيْ لَنْ نُصْلِحَ مِنْكَ مَا أَفْسَدْتَ فَقَصَّهَا الطُّفَيْلُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ وَلِيَدَيْهِ فَاغْفِرْ ۔ رواه مسلم مشکوٰۃ ص ۳۰۱

ترجمہ: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کیطرف ہجرت فرمائی تو طفیل بن عمرو اور انکے ہمراہ انکی قوم کے ایک شخص نے بھی ہجرت کی حسب الاتفاق وہ شخص بیمار پڑ گیا اور تکلیف کی شدت کی تاب نہ لاکر اس نے اپنے تیر کے پیکان ہاتھ میں لئے اور اپنے ہاتھوں کے پورے کاٹ ڈالے جسکی وجہ سے اسکے ہاتھوں سے خون بہ پڑا یہاں تک کہ اسکا انتقال ہوگیا۔ طفیل بن عمرو نے انکو خواب میں دیکھا ان کی صورت تو بہت اچھی تھی لیکن وہ اپنے دونوں ہاتھ ڈھانکے ہوئے تھے انہوں نے اُن سے پوچھا کہو تمہارے پروردگار نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہجرت کرنیکی برکت سے مجھکو بخش دیا۔ انہوں نے کہا اچھا تو پھر آپ کے دونوں ہاتھ ڈھکے ہوئے کیوں نظر آرہے ہیں، انہوں نے کہا کہ مجھ پر یہ عتاب ہوا اور مجھ سے کہا گیا کہ جو تو نے خود بگاڑ لیا ہے اُس کی اصلاح ہم ہرگز نہیں کرینگے۔ یہ خواب طفیل رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیان کیا اسی وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا کی

کہ الٰہی اسکے دونوں ہاتھوں کو بھی بخشدے۔ (مسلم شریف)

شرح: عالمِ برزخ کا یہ منظر بھی عجیب ہے کہ یہاں ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ مؤمن کی مغفرت تو ہو جاتی ہے مگر جرم کی سزا بھی مل کر رہتی ہے اب یہاں دیکھئے کہ اس صحابی کی مغفرت تو ہو گئی مگر اسکے ہاتھ اسکی لغزش کے باعث پھر سزا بھگتا کئے اور بارگاہ رب العزت کی جانب سے اس محرومی کا جو سبب بیان ہوا وہ بھی کتنا مؤثر، کتنا معقول اور کتنا عبرتناک ہے یعنی یہ کہ جو اسکی بنائی ہوئی چیز کو خود بگاڑے تو اسکی درستی اور اصلاح کی قدرت ضمانت نہیں دیگی، اللہ رے شانِ رحمت اور اسکے ساتھ اللہ رے شانِ بے نیازی کہ اتنی سی کوتاہی سے اتنی سی کسر بھی رہ گئی مگر اتنا خوش نصیب کون ہوگا جسکی تقصیر کی تصویر اس طرح خواب میں دکھلا دی جائے اور پھر وہ رحمۃ اللعٰلمین کے علم میں بھی آجائے اور اسپر بے چین ہو کر آپکے محبت بھرے ہاتھ اسکی اس کوتاہی کی مغفرت کیلئے اٹھ جائیں، پھر ارحم الراحمین کو یہ کب گوارا ہو سکتا تھا کہ وہ ان پیارے ہاتھوں کو یونہی خالی واپس فرما دیتا، اس حدیث میں ایک اور اہم سبق یہ بھی ملتا ہے کہ ایک مسلمان کیلئے جو صورت قدرت خود پسند فرما چکی ہے اگر وہ اپنے ہاتھوں سے اسمیں کوئی ناجائز ترمیم کرلے تو اسکے بگاڑنیکا ذمہ دار

وہ خود ہی ہوگا اور اب اسکے لئے وہ پیارے ہاتھ کہاں جو اس کی مغفرت طلب کرنے کیلئے اٹھیں، اسی لئے حدیث میں ایک عام قانون ان الفاظ میں ارشاد ہوا ہے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ خدا لعنت کرے اُن عورتوں پر جو نمائشی حسن پیدا کرنے کیلئے اپنی جانب سے خدا تعالیٰ کے پیدا کردہ اعضا میں تغیر اور ترمیم کرتی ہیں مثلاً وہ عورتیں جو اپنے ہاتھوں یا رخسار پر مشینوں کے ذریعہ سے مختلف قسم کی تصویریں بناتی ہیں اور اسی طرح وہ عورتیں بھی جو اپنے جسم پر مختلف قسم کی تصویریں بنواتی ہیں اور وہ عورتیں بھی جو اپنے چہرہ کے اوپر پیدا شدہ بالوں کو خوشنمائی کے لئے نُچواتی ہیں اور اسی طرح وہ عورتیں بھی جو سوہان کے ذریعہ سے اپنے دانتوں کا حُسن بڑھانے کیلئے انکا درمیانی فاصلہ بڑھاتی ہیں۔ الیٰ آخرہٖ متفق علیہ (مشکوٰۃ شریف صفحہ ۳۸۱)

دوسری حدیث میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ لعنت کرے ان مَردوں پر جو عورتوں کیساتھ اپنی صورت کو زبردستی مشابہ بناتے ہیں اور اسیطرح خدا لعنت کرے ان عورتوں پر جو مردوں کی مشابہ بننا چاہتی ہیں۔ (بخاری شریف۔ مشکوٰۃ شریف)

اس کا بہت بڑا عمیق ایک فلسفہ یہ بھی ہے کہ قدرت نے نوعِ انسانی کی دو صنفوں میں جو قدرتی امتیاز پیدا فرما دیا ہے اسکو اٹھانے کی کوشش کرنا یہ قدرتی خلقت کی تغیر میں بہت بڑی جرأت ہے اور اُن قدرتی اسرار و حِکَم کو فنا کر دینا ہے جو اُسنے اِس امتیاز میں پنہاں رکھے تھے، دنیا میں ہر کمپنی اپنی اپنی مصنوعات کا خاص موڈل رکھتی ہے اور کسی دوسرے کو اس موڈل کے ترمیم کرنے کا اختیار نہیں ہوتا پھر قدرت یہ کب پسند کر سکتی ہے کہ اس نے اپنی خاص مخلوق میں جس صنف کے لئے جو موڈل پسند کر لیا ہے اس میں کوئی زبردستی دست اندازی کرے۔

قرآن یہ نہیں چاہتا کہ تمہارے ہر عمل کیلئے صرف ایک ہی راہ متعین کر دے بلکہ وہ انسانی ضعف کے پیشِ نظر یہ چاہتا ہے کہ اگر ضابطہ میں کوئی وسعت مل سکتی ہے تو اس سے فائدہ حاصل کیا جا سکے

(۵۱) عَنْ اَبِی ثَعْلَبَۃَ الْخُشَنِیِّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ فَرَضَ فَرَائِضَ فَلَا تُضَیِّعُوْھَا وَحَرَّمَ حُرُمَاتٍ فَلَا تَنْتَھِکُوْھَا وَحَدَّ حُدُوْدًا فَلَا تَعْتَدُوْھَا وَسَکَتَ عَنْ اَشْیَاءَ مِنْ غَیْرِ نِسْیَانٍ فَلَا تَبْحَثُوْا عَنْھَا۔ رواہ الدارقطنی مشکوٰۃ صفہ ۳۲

ترجمہ: ابی ثعلبہ الخشنیؓ سے روایت ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ چیزیں فرض قرار دی ہیں انکی بڑی حفاظت اور نگرانی کرنا اور اُن میں ادنیٰ سی فروگذاشت بھی نہ کرنا کہیں وہ برباد نہ ہوجائیں اور کچھ باتیں حرام قرار دی ہیں تم ان کا پورا پورا احترام کرنا اور انکے ارتکاب کرنے سے دور دور رہنا اور انکے احترام میں ذرا سا فرق نہ پڑنے دینا اور کچھ باتوں کی حدیں مقرر کردی ہیں تم ان سے ہرگز تجاوز نہ کرنا اور کچھ باتیں ایسی بھی ہیں جن سے قرآن نے قصداً سکوت اختیار فرمایا ہے خبردار اس سکوت کو کسی سہو ونسیان کی بنا پر مت سمجھنا، لہٰذا تم اسکے کھود کرید کے درپے نہ ہونا۔

شرح: شریعت میں مختلف قسم کے احکامات آئے ہیں بعض کو فرض قرار دیا گیا ہے اور بعض کو حرام اور ان دونوں کو صاف طور پر علیحدہ علیحدہ بیان فرما دیا گیا ہے، جسکے بعد کسی تحقیق اور تفتیش کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی اسلئے جہاں جس بات کی اہمیت ملحوظ رکھنی ضروری ہے، حدیث مذکور میں اس پر تنبیہ کردی گئی ہے اور جس طرح ملکوں کی حدود مقرر کردی جاتی ہیں اسی طرح شریعت نے بھی کچھ حدیں مقرر فرمائی ہیں جنکے عبور کرنے کی تمکو ممانعت فرمائی گئی ہے، یہ تمام باتیں ایسی ہیں جو بالکل ظاہر ہیں اور کسی مزید تشریح کی محتاج نہیں ہیں لیکن جو بات بڑی

اہم اور قابلِ تنبیہ ہے وہ یہ ہے کہ کج فطرت انسان بہت سے
مواقع پر قانونی الفاظ میں بے وجہ ایسی تشریحات کا متلاشی
رہتا ہے جن سے قانون میں قصداً اغماض کیا جاتا ہے اور بعض
مرتبہ یہ اغماض اسلئے ہوتا ہے کہ اگر اس قانون کے ہر پہلو کی پوری
پوری شرح کر دی جائے تو پھر انکے بعد انکے پورا کرنے میں ذرا سا
انحراف کرنا بھی قانون شکنی کے جرم کے مُرادف ہوتا ہے اس لئے
قانونی الفاظ میں اتنی گنجائش رکھی جاتی ہے کہ بہ وقت ضرورت
اس وسعت سے ایک کمزور فطرت انسان کو اگر کوئی فائدہ پہنچنا
ممکن ہو تو وہ پہنچ سکے۔ مثال کے طور پر سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل
کو ایک قتل کی تفتیش کے معاملہ میں صرف یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ
ایک گائے ذبح کریں اگر وہ اس مجمل حکم سے فائدہ اٹھا لیتے اور
کوئی بھی معمولی گائے ذبح کر لیتے تو قانون کا منشا پورا ہو جاتا
لیکن انہوں نے بے وجہ اپنے رسول سے یہاں بحثیں شروع
کر دیں اور اپنی جانب سے ایسے بے معنی سوالات اٹھائے کہ پھر
انکے جوابات کے بعد ان شروط کے مطابق گائے کا ملنا ہی مشکل
ہو گیا آخر کار اس گائے کے خریدنے میں انکو بہت بڑی قیمت
ادا کرنی پڑی۔

اس لئے قرآن پاک کے الفاظ میں جگہ جگہ اتنی گنجائش رکھی گئی ہے کہ اسکے تحت ائمہ اربعہ کے علاوہ اور بھی دین کے اماموں کو اسکی تشریحات میں اختلاف کرنیکا جائز موقع مل گیا اور ان مختلف دفعات کا فائدہ جو قرآنی الفاظ کی وسعت کے تحت پیدا ہو سکتی تھیں مختلف طبقاتِ انسانی کو پہنچ گیا اور اسی بناپر اختلافِ اُمت کو رحمت قرار دیا گیا ہے، اگر قانونی الفاظ میں اس ضرورت کے ماتحت ہر جگہ پوری پوری وضاحت کر دی جاتی تو پھر کہیں بھی کسی ادنیٰ سی لچک کا موقع باقی نہ رہتا اور ہر طبقہ کے لئے زندگی کے ہر شعبہ میں بس ایک ہی راہ باقی رہ جاتی مثلاً ملکی لحاظ سے بعض مقامات پر پانی بہ افراط موجود ہے اور بعض مقامات پر بہت کمیاب ہے اسلئے اب طہارت اور نجاست کا کوئی ایک ہی قانون اتنی وضاحت سے مقرر کر دیا جاتا کہ پھر اسکے بعد کوئی دوسرا احتمال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تو پھر یہ ظاہر ہے کہ جن ممالک میں پانی کمیاب ہے وہاں ان احکام کے نفاذ میں بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا، اور اگر شروع سے ہی اسمیں اصولاً پوری وسعت رکھی جاتی تو جہاں پانی بہ افراط ملتا ہے وہاں اتنی وسعت نہ صرف غیر ضروری

رہتی ہے بلکہ ممکن ہے کہ طہارت اور نجاست کے درمیان کوئی
حدفاصل مقرر کرنا ہی باریک بات بن جاتی، یہاں یہ بات یاد
رکھنی ضروری ہے کہ جسطرح آج ہمارے موجودہ قانون (LAW)
میں یہ حق ہر شخص کا نہیں ہے بلکہ ہر وکیل اور ہر عدالت کا بھی
نہیں ہے کہ وہ قانون کی شرح جو بھی اسکی رائے میں آجائے
وہ کر ڈالے اسی طرح اسلامی قانون میں بھی ہر بے بال و پر کا
یہ حق نہیں ہے کہ وہ محض اپنی عقلی رائے کے مطابق قرآنی قانون
کی جو چاہے وہ من مانی شرح کر بیٹھے یہاں بھی اسکے لئے بہت سی
قیود ہیں جسکی رعایت کئے بغیر محض اپنی رائے سے قرآن میں
کسی قید و شرط کا اضافہ یا کمی کرنی یا اس کی کوئی ایسی تشریح
کرنی جو آج تک احادیثِ نبویہ اور قضایا صحابہ و تابعین پھر
اسکے بعد اسلام کے معتمد ججوں نے کبھی نہ سمجھی ہو یہ کیسے جائز
تصور کیا جاسکتا ہے۔

افسوس ہے کہ آج جبکہ ہم کو اسلامی دورِ آزادی کا دیکھنا
نصیب ہوا تو ہم اس حقیقت واقعیہ کا انکار صرف ایک یہ فقرہ
کہکر کر دیتے ہیں کہ قرآن پر کسی کا اجارہ داری نہیں ہے اور
اتنا بھی نہیں سوچتے کہ اگر ایک ڈاکٹر کسی وکیل سے جا کر یہ کہے

کہ عدالت کی پیروی کرنے پر آپ کی کوئی اجارہ داری نہیں ہے
یا ایک وکیل ایک ڈاکٹر سے یہ کہنے بیٹھ جائے کہ ڈاکٹری آپ کی
کوئی اجارہ داری نہیں ہے تو کیا اسکا یہ کہنا معقول ہوگا؟
بیشک نہ قرآن کسی کی اجارہ داری ہے اور نہ کسی خاص فن پر
کسی کی کوئی اجارہ داری ہے، بلکہ ہر وہ شخص جو اس اجارہ داری
کی قیمت ادا کریگا وہ خود بھی اس اجارہ داری کا شریک بن
سکتا ہے لیکن قیمت ادا کئے بغیر اس اجارہ داری کی توڑنا ڈنڈے
کے زور سے تو ممکن ہے مگر کسی معقولیت سے نہیں، غالباً اسی
اجارہ داری کے توڑنے کے لئے دماغوں میں یہ تجویز پیدا ہوئی ہو
کہ سرے سے احادیثِ نبویہ کا انکار کر دیا جائے اور جب احادیث
کی کوئی قید باقی نہ رہے تو پھر صحابہ اور تابعین کے فیصلے اور
قرونِ اولیٰ کی حکومتوں کے ججوں کے احکامات کی کیا قدر و قیمت
رہ سکتی ہے۔

سچ ہے کہ جب کسی قوم پر ادبار آتا ہے تو وہ سب سے پہلے
اپنے چوٹی کے افراد سے اختلاف اور انکے علمی ذخائر کی ناقدری
میں گرفتار ہو جاتی ہے اسی ناقدری کی بدولت انجیل اور توراۃ
خواہ انکی صحت کا کتنا ہی بلند آہنگی کے ساتھ دعویٰ کیا جائے

مگر وہ اپنی صحیح صورت میں موجود نہ رہ سکیں! ور اگر کہیں قرآنِ کریم
کی حفاظت کی کفیل قدرت خود نہ بن جاتی تو پھر حدیث کی
طرح قرآن پاک کا بھی انکار کر دینے میں دشواری کیا تھی آخر
عیسائی اور انکے ساتھ بعض جماعتیں جو اپنی اسلام کی طرف
نسبت کرتے ہیں وہ قرآنِ پاک کے متعلق بھی محرف ہو جانیکا
دعویٰ کرتے ہیں وَالعِیَاذُ بِاللہ،

یہ دوسری بات ہے کہ اس دعویٰ کے لئے ان کے پاس ثبوت
تو کیا ہوتا بلکہ انکا ضمیر بھی خود اُن پر ملامت کرتا ہوگا، کاش کہ
مسلمان قرآن کریم کی حفاظت کا عقیدہ رکھتے ہوئے اسکے معنیٰ
کو صحیح طور پر سمجھیں، آخر جنکے واسطہ سے یہ قرآن پہنچا ہے انہیں
کے واسطہ سے احادیثِ نبویہ کا ذخیرہ ہمارے ہاتھوں میں پہنچا
ہے پھر اگر قرآن کو تسلیم کیا جائے اور اسکی جو تشریحات آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم نے بذریعہ وحی خود ارشاد فرمائی ہیں یا آپ کے
دیکھنے والے صحابہؓ نے ان کو سمجھا ہے یہ تمام کا تمام ذخیرہ
ناقابلِ اعتماد رہ جائے تو پھر قرآنی حفاظت کا مفہوم صرف الفاظ
تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے اور بعثت نبوت کا سب سے اہم
مقصد یعنی قرآنی قانون کی تشریحات اور ذیلی دفعات یکسر گم

ہو جاتی ہیں، اسکی تفصیل مقدمہ "ترجمان السنہ" جلد اول میں ملاحظہ کر لی جائے۔

حدیث مذکور کے آخری جملہ کی اہمیت خود قرآنِ عزیز نے اتنی محسوس کی ہے کہ اس دفعہ کو صراحت کیساتھ ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے:۔ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَاِنْ تَسْئَلُوْا عَنْھَا حِیْنَ یُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ (اے ایمان والو مت پوچھو ایسی باتیں کہ اگر تم پر کھولی جاویں تو تم کو بری لگیں اور اگر پوچھو گے یہ باتیں ایسے وقت میں کہ قرآن نازل ہو رہا ہے تو تم پر ظاہر کر دیجاوینگی)

(پارہ ۷ رکوع ۴)

ان آیات میں اسکی ممانعت فرمائی گئی ہے کہ جو بات شارع علیہ السلام نے خود بیان نہیں فرمائی اسکے متعلق تم دور از کار فضول سوالات مت کیا کرو کیونکہ جسطرح اسکا بیان سہولت کا سبب ہے اسی طرح جہاں اس نے سکوت اختیار فرمالیا ہے وہ بھی رحمت اور سہولت کا سبب ہے اگر تم قرآن پاک کے نزول کے زمانہ میں ایسے سوالات کا دروازہ کھولو گے تو بہت ممکن ہے کہ مبادا انکے جوابات میں بعض ایسے احکام نازل ہو جائیں، جو

قانونی آزادی تم کو پہلے حاصل تھی وہ سلب ہو جائے پھر یہ سخت جرم کی بات ہو گی کہ جو قانون خود مانگ کر تم نے بنوایا ہے اسکو پورا نہ کر سکو۔ اس بارے میں بہت سی احادیث بھی وارد ہیں، ایک حدیث کا مضمون یہ ہے کہ مسلمانوں میں بڑا مجرم وہ ہے جسکے سوالات کی بدولت کوئی چیز پہلے سے حرام کردیجائے جو پہلے حرام نہ تھی۔

کسی بگڑے ہوئے ماحول میں صحیح مسلک پر قائم رہنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا ہاتھ میں چنگاری پکڑنا

(۵۲) عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَاْتِیْ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ اَلصَّابِرُ فِیْہِمْ عَلٰی دِیْنِہٖ کَالْقَابِضِ عَلَی الْجَمْرِ رواہ الترمذی وقال ھٰذا غریب اسناداً (مشکوٰۃ صفحہ ۴۵۹)

ترجمہ: انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگوں کے سامنے ایک زمانہ وہ آئیگا جسمیں اپنے دین پر قائم رہنا اتنا ہی مشکل ہو گا جتنا کہ چنگاری کا ہاتھ میں پکڑنا۔

شرح: ایک زمانہ تھا جبکہ دین اختیار کرنا لوگوں کی نظروں میں اتنا ہی محبوب تھا جتنا کہ آج سیم وزر ہے بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ لیکن بدقسمتی سے جب کسی قوم کی حالت بگڑنے

لگتی ہے تو پھر اسکے عادات و اخلاق ہی نہیں بلکہ اسکے عقائد و اعمال بھی بدلنے لگتے ہیں، آخر کار اس درجہ بگڑ جاتے ہیں کہ جسکو وہ اپنے دور اول میں قابلِ فخر سمجھا کرتی تھی اپنے دورِ انحطاط میں اسی کو قابلِ نفرت سمجھنے لگتی ہے اور تنزل کی یہ رفتار اسی پر جاکر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ بڑھتے بڑھتے وبا کیطرح عام طور پر پھیل جاتی ہے پھر نوبت یہاں تک جا پہنچتی ہے کہ اگر اُسوقت کوئی خوش بخت اپنے صحیح عقیدہ پر قائم رہنا بھی چاہے اور وہ بیچارہ صرف اپنا دین علٰحدہ رہ کر بچانا چاہے تو یہ بھی اسکے لئے ممکن نہیں رہتا اور بد دین دنیا اسکو مجبور کرکے یہ چاہتی ہے کہ اسکو بھی اپنے ہی رنگ میں رنگ لے، ان حالات میں اسکو اپنے دین پر قائم رہنا ٹھیک اتنا ہی مشکل ہو جاتا ہے جتنا کہ حدیثِ مذکور کے الفاظ میں ادا فرمایا گیا ہے ایک مسلمان کے لئے ان حالات میں اسکے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں رہتا کہ وہ اپنا دین بچاکر ان سے علٰحدگی اختیار کرلے، اسی قسم کے مایوس کُن حالات میں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام نے اپنی قوموں کو چھوڑ کر مجبوراً ہجرت کی راہ اختیار فرمائی ہے۔

حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ انہوں نے لوگوں کو اسکی دعوت دی کہ آؤ ہم سب ملکر خدا تعالیٰ کی عبادت کریں انہوں نے جواب دیا کہ ہم یہ نہیں کرینگے، انہوں نے فرمایا کہ اچھا اگر تم عبادت نہیں کرتے تو میں عبادت کرونگا تم میری مدد کرو انہوں نے کہا یہ بھی نہیں کرینگے اسپر انہوں نے فرمایا کہ اگر میری مدد نہ کرو تو کم از کم مجھے ایذاء تو مت دو، انہوں نے کہا ہم اس سے بھی باز نہیں آئینگے آخر کار انہوں نے فرمایا کہ اگر تم اتنا بھی نہیں کر سکتے تو پھر لو میرا اسلام لو اور یہ کہہ کر وہاں سے رخصت ہو گئے۔

اسلئے لازم ہے کہ جب کسی بگڑے ہوئے ماحول کی اصلاح سے مایوسی ہو جائے اور اسکی اصلاح کی کوئی صورت باقی نہ رہے اور خود اپنا دین خطرہ میں نظر آنے لگے تو پھر گوشہ نشینی اختیار کر لینا ہی بہتر ہے۔ امام بخاریؒ نے اسپر ایک مستقل باب قائم فرمایا ہے اور اسکا عنوان یہ رکھا ہے: "مِنَ الدِّیْنِ الْفِرَارُ مِنَ الْفِتَنِ"

خدا تعالیٰ کی محبّت کی علامت سرمایہ و دولت نہیں ایمان و تقویٰ ہے

(۵۳) عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ قَسَمَ بَيْنَكُمْ اَخْلَاقَكُمْ كَمَا قَسَمَ بَيْنَكُمْ اَرْزَاقَكُمْ وَاِنَّ اللّٰهَ يُعْطِي الدُّنْيَا مَنْ يُّحِبُّ وَمَنْ لَّا يُحِبُّ وَلَا يُعْطِي الْاِيْمَانَ اِلَّا مَنْ يُّحِبُّ۔

رواہ الحاکم فی المستدرک ج ۱ صفحہ ۳۳ وقال الذھبی صحیح الاسناد ورواہ احمد اطول من ھٰذا کما فی المشکوٰۃ صفحہ ۴۲۵

ترجمہ: حضرت ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ نے جسطرح تم میں روزی تقسیم کی ہے اسی طرح تمہارے اخلاق کی بھی تقسیم کردی ہے (جیسے رزق تنگ وفراخ رکھا ہے ایسے ہی اخلاق بھی کسی کے تنگ اور کسی کے وسیع رکھے ہیں) وہ دنیا تو (سب ہی کو دیتا ہے) اسکو بھی جس سے محبت کرتا ہے اور اسکو بھی جس سے محبت نہیں کرتا لیکن دولت ایمان صرف اسی کو دیتا ہے جسکو محبوب رکھتا ہے۔

شرح: اس حدیث میں ایک اہم سبق یہ ملتا ہے کہ خدا کی محبت کی علامت دولتِ ایمان ہے سیم وزر کی دولت نہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ سیم وزر کی دولت دوست ودشمن میں یکساں طور پر بکھیر دی گئی ہے لیکن دولتِ ایمان صرف اسکے دوستوں ہی کے حصہ میں لگا دی گئی ہے۔

یہاں دو اہم مسائل پر اور روشنی پڑتی ہے کہ رزق اور

اخلاق یہ دونوں موہوب ہیں یا مکسوب ؟ اخلاق کے متعلق "علم الاخلاق" میں اس پر مستقل بحث کی گئی ہے کہ اخلاق کسبی ہیں یا خلقی اور اس بارے میں دونوں قول ہیں، لیکن حدیث کا فیصلہ دونوں کے متعلق ایک ہے اور وہ یہ کہ وہ ربّانی تقسیم پر موقوف ہیں، مسند امام احمد میں ابو درداءؓ سے روایت ہے کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے اور دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اسکے متعلق گفتگو کر رہے تھے کہ اچانک آپنے ارشاد فرمایا کہ: جب تم کسی پہاڑ کے متعلق یہ سنو کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا ہے تو اس بعید بات کی تو تصدیق کر لینا لیکن اگر کسی شخص کے متعلق یہ سنو کہ اسکی فطرتی عادتیں بدل گئی ہیں تو اس بات کی تصدیق نہ کرنا، کیونکہ وہ بالآخر اسی کی طرف لوٹیگا جو اسکی فطری خِلقت ہوگی۔ (مشکوٰۃ شریف صفحہ ۲۴) "جبل گردد و جبلّی نہ گردد" اسی کا ترجمہ ہے۔

اب رہا رزق کا مسئلہ تو حدیث اسکو بھی خدائی تقسیم کے ماتحت قرار دیتی ہے اور آنکھیں اس کا مشاہدہ کرتی ہیں کہ بہت سے بے عقل مالدار اور بہت سے ہوشیار اور تعلیم یافتہ تنگ دست نظر آتے ہیں، ایک شخص تجارت کرتا ہے اور تھوڑی سی مدت میں

میں کروڑپتی نظر آتا ہے اور ایک شخص مدتوں اپنا خون پسینہ ایک کرتا ہے اور پھر بعض اوقات اپنا اصل سرمایہ بھی کھو بیٹھتا ہے۔ اس کھلے ہوئے تجربہ کے بعد فیصلہ تو آسان تھا لیکن دنیا قارُون کے الفاظ میں پھر یہی کلمات کہتی ہے جس کے خزائن کی کنجیاں اونٹوں پر لد کر جایا کرتی تھیں کہ اِنَّمَآ اُوْتِیْتُہٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ (یہ مال تو مجھ کو ملا ہے ایک ہنر سے جو میرے پاس ہے) (پارہ ۲۰ رکوع ۱۱) یعنی "یہ دولت میرے علم وفہم اور میری جدوجہد کا نتیجہ ہے۔

یہاں کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ حدیث کو اپنے رزق کی ترقی اور اپنے اخلاق کی بہتری کی جدوجہد سے روکنا منظور ہے، ان دونوں باتوں کا تو انسان شرعًا مامور ہے اور حلال رزق کے لئے جدوجہد کرنا تو انسانی فرض ہے بلکہ ایک ایسی مخفی حقیقت پر متنبہ کرنا منظور ہے جسکو مادی نظریں نہیں دیکھ سکتیں اور وہ یہی کہ اگر کسی کو رزق وسیع ملتا ہے یا کسی کے اخلاق اعلیٰ ہیں تو یہ اسکا فرض ہے کہ وہ ان نعمتوں کو اپنا کمال تصور نہ کرے بلکہ الٰہی نعمت اور اسکی تقسیم کا نتیجہ سمجھے، بس مذہب اور سائنس میں اسکے سوا اور کچھ فرق نہیں کہ عمل کی اگرچہ دونوں راہ دکھلاتے

ہیں اور اسکو ضروری سمجھتے ہیں مگر مذہب اسکا رشتہ خالقِ کائنات پر جاکر ختم کر دیتا ہے اور سائنس خود اپنی جد وجہد پر مغرور و مفتون بنائے رکھتی ہے، لہٰذا عملی جد وجہد کے لئے مذہب کی جانب سے کسی غلط فہمی میں پڑنیکی ضرورت نہیں یہ اپنے اپنے مشرب کی بات ہے کہ اپنا رشتہ مختارِ مطلق، خالقِ کائنات سے جوڑ دو یا بے حس وحرکت محض مادہ کی استعداد کے ساتھ لگا دو شاعر کہتا ہے ؎

بلبل کو دیا نالہ تو پروانہ کو جلنا
غم ہمکو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

یعنی جو کچھ بھی ہوا وہ سب خالقِ کائنات کی تقسیم سے ہوا۔

اسلامی معاشرت میں بیکار باتوں کا مشغلہ اسلامی حُسن پر ایک بدنُما داغ شمار ہوتا ہے

(۵۴) عَنْ عَلِیِّ بْنِ الْحُسَیْنِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهٗ مَالَا يَعْنِيْهِ

رواہ الترمذی وغیرہ وحسنہ الحافظ ابن رجب الحنبلیؒ فی جامع العلوم والحکم مشکوٰۃ صفہ ۴۱۳

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے آدمی کے اسلام کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ بیکار باتوں کا قطعاً مشغلہ چھوڑ دے۔

شرح: اس حدیث کی اہمیت کے پیشِ نظر مالا یعنی کے لفظ کی کچھ توضیح مناسب معلوم ہوتی ہے، حافظ ابن رجبؒ فرماتے ہیں کہ لفظی وسعت کے لحاظ سے تو "لا یعنی" کا لفظ اقوال و افعال سب کو شامل ہے لیکن محاورہ و استعمال کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اسکا زیادہ تر اطلاق لغو باتوں پر ہوتا ہے اسی کی طرف حسب ذیل آیات و احادیث میں اشارہ کیا گیا ہے:

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ (انسان کوئی بات اپنے منہ سے نہیں نکالتا مگر ایک نگراں اسکے لکھنے کیلئے تیار رہتا ہے)

(پارہ ۲۶ رکوع ۱۶)

لَا خَيْرَ فِي كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ (ان کی اکثر سرگوشیوں میں کوئی بہتری اور خیر کا نام بھی نہیں ہوتا مگر ہاں صرف ان سرگوشیوں میں جو خیرات اور نیک باتوں کی صلاح دینے کے متعلق ہوں) پارہ ۵ رکوع ۱۴

(۱) آدمی کے اسلام کی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ بیکار باتیں نہ کرے۔
(مسند امام احمد)

(۲) جو آدمی اپنے عمل اور باتوں کا موازنہ کرتا رہیگا وہ خود بخود صرف حاجت کی بات کرنیکا عادی بن جائیگا۔ (ابن حبان)

(۳) اسی حقیقت کے مخفی رہنے کی وجہ سے حضرت معاذؓ نے یہ سوال کیا تھا یا رسول اللہ جو باتیں ہم کرتے ہیں کیا ان پر بھی ہم سے گرفت کیجائے گی۔ آپ نے فرمایا کیوں نہیں، زیادہ تر لوگ اسی جا و بیجا زبان چلانے کی بدولت ہی دوزخ میں منہ کے بل گرائے جائینگے۔

(۴) حضرت ام حبیبہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں کہ ابن آدم کے منہ سے جو بات نکلتی ہے وہ اسکے نقصان ہی نقصان کی ہوتی ہے نفع کی نہیں ہوتی، بجز ان صورتوں کے (۱) بھلی بات کا حکم دینا (۲) بری بات سے روکنا (۳) اور اللہ کی یاد کرنا۔ (ترمذی)

(۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں ایک صحابی کا انتقال ہو گیا تو کسی نے کہا تجھے جنت کی بشارت ہو، آپ نے فرمایا تمہیں کیا خبر ہے شاید اس نے کبھی بیکار بات منہ سے نکالی ہو یا اپنی حاجت سے زیادہ چیز پر بخل کیا ہو۔ (ترمذی)

(۶) ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا یا رسول اللہ

میں اپنی قوم کا سردار ہوں جو کہتا ہوں میری مانتے ہیں، ان سے کیا کہوں، آپ نے فرمایا کہ ہر کس و ناکس کو سلام کیا کریں اور غیر ضروری باتیں کرنا چھوڑ دیں۔ (ابن ابی الدنیا)

(۷) ایک صحابی کی بیماری میں (عیادت کیلئے) کچھ لوگ گئے دیکھا تو وہ ہشاش بشاش تھے، سبب دریافت کیا تو انہوں نے کہا دو عمل میرے پاس ایسے ہیں کہ ان سے زیادہ بخشش کی امید مجھے کسی عمل پر نہیں ہے، ایک تو یہ کہ میں غیر ضروری باتیں نہ کرتا تھا، دوم یہ کہ تمام مسلمانوں کی طرف سے میرا سینہ صاف اور ٹھنڈا رہا کرتا تھا۔ (ابن ابی الدنیا)

(۸) حسن بصریؒ سے روایت ہے کہ کسی آدمی سے اللہ تعالیٰ کے اعراض کرنیکی ایک علامت یہ بھی ہے کہ وہ اسکو بیکار باتوں کے مشغلہ میں الجھا دے۔

(۹) سہل تستریؒ فرماتے ہیں جو بے ضرورت باتیں کرے گا وہ راست گوئی سے محروم ہو جائے گا۔

(۱۰) معروف کرخیؒ فرماتے ہیں آدمی کے بیکار باتوں کا مشغلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو رسوا کرنے کی ایک علامت ہے۔ اس قسم کی احادیث اور بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے

کہ اس حدیث کا زیادہ تر تعلق اقوال ہی کے ساتھ ہے، خلاصہ یہ ہے کہ جب انسان بیکار اور بے حاجت قول و فعل چھوڑنے اور ضرورت کے مطابق بات اور اسی کے موافق کام کرنے کا عادی بن جائے تو اسے بشارت ہو کہ اب اس نے صفت انسانیت میں قدم رکھدیا ہے اور اب اسکی ایک نیکی صرف دس یا سات نیکیوں ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ اسکے لئے رحمت کا وہ وسیع دروازہ کھل گیا ہے جس کی کوئی حدود نہایت نہیں ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا نازک حسن بیکار باتوں کی ذرا سی ٹھیس بھی برداشت نہیں کرتا پھر آپ یہ کیا سمجھے بیٹھے ہیں کہ آپ کی غفلت اور من مانی آزادی کے بعد بھی اس کا بال بِیکا نہیں ہوتا۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ لقمان حکیم سے کسی نے پوچھا آپ کو یہ مرتبۂ عالی کیسے ملا۔ آپ نے فرمایا تین باتوں سے:
(۱) راست گوئی (۲) ادائے امانت (۳) اور بیکار باتوں سے کنارہ کشی کی عادت سے (موطا)

یہ بات قاعدۂ کلیہ کے طور پر یاد رکھنی چاہئے کہ اسلام میں دنیا کے ہر گوشہ کا رُخ بھی آخرت ہی کی طرف رہتا ہے اور

اسلام میں خدا پرستی کی یہی سب سے بڑی روح ہے لہٰذا جنکی
دنیا کا رُخ ہر جگہ آخرت سے کٹ چکا ہے ان کو ہر جگہ یہ مغالطہ
لگتا ہے کہ اسلام میں دنیا کی تعلیم نہیں، اب سوچئے کہ موجودہ
دنیا میں کسی بھی ترقی یافتہ ملک میں کیا بیکاری کا وجود ملتا
ہے اس کا وجود اگر ہے تو ایک صرف ہم مسلمانوں میں ہے
بیشک یہ ہماری پسماندگی کا ایک بھاری سبب ہے مگر اسکے
ذمہ دار ہم خود ہیں مذہب نہیں، ہمارے مذہب کی تعلیم تو یہ
ہے کہ ہماری زندگی کا ایک لمحہ بھی بیکاری میں صرف نہ
چاہئے، اب اگر اس میں نیت آخرت کی ہے تو پھر یہ آخرت
کے اجر کا موجب بھی ہے اور نُوْرٌ عَلٰی نُوْر ہے آخر کافر کی
دنیا میں اور ایک مسلمان کی دنیا میں کسی مرحلہ پر بھی فرق
کرنے پر آپ کبھی راضی ہوں گے بھی یا نہیں۔

سب سے اچھا مفتی خود انسان کا ضمیر ہے بشرطیکہ وہ آفت رسیدہ نہ ہو

(۵۵) عَنْ وَابِصَةَ بْنِ مَعْبَدٍؓ قَالَ اَتَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ

صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ جِئْتَ تَسْأَلُ عَنِ الْبِرِّ وَالْإِثْمِ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ الْبِرُّ مَا اطْمَأَنَّتْ إِلَيْهِ النَّفْسُ وَاطْمَأَنَّ إِلَيْهِ الْقَلْبُ وَالْإِثْمُ مَا حَاكَ فِي النَّفْسِ وَتَرَدَّدَ فِي الصَّدْرِ وَإِنْ أَفْتَاكَ النَّاسُ وَأَفْتُوكَ۔

رواہ احمد والدارمی فی مسندیہما باسناد حسن ترمذی صفحہ ۲۲۰

ترجمہ: وابصہ بن معبدؓ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، آپ نے فرمایا کیا گناہ اور نیکی کی تعریف پوچھنے آئے ہو؟ میں نے عرض کیا جی ہاں فرمایا تو اپنے دل سے فتویٰ لے لیا کرو جس بات پر دل ٹھک جائے تو وہ نیکی کی بات سمجھو اور جس میں کھٹک اور تردد باقی رہے وہ گناہ کی بات سمجھو اگرچہ لوگ تجھے کتنے ہی فتوے دیتے رہیں۔

(مسند احمد و دارمی)

شرح: اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو فطرتِ اسلام پر پیدا کیا ہے، ان میں اچھے برے، حق و ناحق کا احساس اور اس کا امتیاز اسی طرح ودیعت فرمایا ہے جس طرح آنکھ میں دیکھنے ناک میں سونگھنے کان میں سننے، اور ہاتھوں میں چھو کر محسوس کرنے کی صلاحیت پیدا کی ہے، جب تک انسان اپنی اصلی فطرت پر قائم رہتا ہے اس کے فطری احساس کی قوت بھی ظاہری احساسات کی طرح

ٹھیک ٹھیک کام کرتی ہے، جسطرح کان ایک اچھے نغمے کی طرف
بلاارادہ لگ جاتے ہیں اور بُرے نغمے سے غیر اختیاری طور پر ہٹ
جاتے ہیں، اسی طرح انسان کا صحیح و سلیم فطری احساس بھی خدا تعالیٰ
کے احکام سے طبعاً مانوس اور منہیات شرعیہ سے فطرةً متنفر ہوتا
ہے، مذکورہ بالا حدیث قلب کی اسی فطری سلامتی پر مبنی ہے۔
لیکن جب فطرتِ انسانی کچھ خارجی اسباب کی بنا پر مجروح
ہو جاتی ہے تو اس میں وہ احساس بھی باقی نہیں رہتا اور جس
طرح بیمار حواس اپنا صحیح کام انجام نہیں دیتے اس کی فطرت
بھی پورے طور پر کام نہیں کرتی اور شدہ شدہ ایسے اسٹیج پر
پہنچ جاتی ہے جہاں اسے حق و ناحق کا کوئی امتیاز ہی باقی نہیں
رہتا یہ انسان اس نابینا کی طرح ہو جاتا ہے جو سرخ و سفید کا نام تو
سنتا ہے مگر ان میں طبعی طور پر پہچان نہیں کرسکتا۔ اسی طرح وہ
انسان جس کی فطرت بیمار ہو جاتی ہے حق و باطل کا فرق صرف
دلائل کی قوت سے ہی سنتا یا سمجھتا ہے حتیٰ کہ اسلام سے اس کی
رغبت اور کفر سے نفرت بھی استدلالی رہ جاتی ہے۔ طبعی
نہیں رہتی یہ انسان صحیح فطرت سے ہٹا ہوا انسان ہے اس کا
احساس غیر معتبر اور بیمار ہے حضرت شیخ مجدّد صاحب رح نے

اپنے مکتوب ۴۶ جلد اوّل میں اسکی خوب تحقیق فرمائی ہے۔
خلاصہ یہ کہ نیک انسان کو نیکی کے ساتھ ایک فطری تناسب
ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح جس طرح لوہے کو مقناطیس سے، اس کا
مطلب یہ ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی امر کا نیکی ہونا
شرعاً معلوم ہو جائے تو ایک انسان کی فطرت کی سلامتی کی علامت
یہ ہے کہ اس کی طرف وہ اپنی قلبی کشش محسوس کرے اسی طرح
اگر کسی شخص کا شرعاً نیک ہونا ثابت ہو جائے تو کسی مشتبہ امر
کے نیک و بد ہونے کی علامت اس کی فطرت ہے اگر اس کی
جانب اس کے دل میں کشش موجود ہے تو سمجھنا چاہئے کہ وہ
نیکی کا عمل ہے ورنہ نہیں۔ ایک صحیح حدیث میں ارشاد ہے
کہ انسان کے جسم میں گوشت کا چھوٹا سا لوتھڑا ہے اگر وہ درست
ہو گیا تو تمام جسم تندرست ہو جاتا ہے اور اگر کہیں وہ بیمار ہوا تو
تمام جسم بیمار ہو جاتا ہے اس کا نام دل ہے لہٰذا انسان کا دل
ایک ایسی چیز ہے کہ اگر وہ صالح ہو جائے تو سب سے بڑا امین ہے
اور اگر بگڑ جائے تو سب سے بڑا خائن ہے اور جب یہ خائن
ہو جاتا ہے تو پھر آئین و ضوابط خواہ کتنے ہی بہتر سے بہتر ہوں
نگران کی کچھ پار نہیں بستی، تمام آئین و ضوابط کے باوجود ایک حاکم

اپنی کرسی پر اپنی غریب رعایا اور حتیٰ کہ ایک بیوی اپنے غریب شوہر کے ساتھ خیانت کرتے ہیں اور ان کا دل بھی اس پر شاہد ہوتا ہے خوب یاد رکھئے کہ پہلے اپنی معاشرت درست کیجئے ورنہ ضوابط صرف ایک باضابطہ بربادی کا ذریعہ ہیں اور بس۔

مسلمانوں میں وہ عبرتناک انقلابات جن کے بعد بڑے بڑے انقلابات کا انتظار کرنا چاہیے

(۵۶) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِذَا اتُّخِذَ الْفَیْءُ دُوَلًا وَّالْاَمَانَةُ مَغْنَمًا وَّالزَّکٰوةُ مَغْرَمًا وَّتُعُلِّمَ لِغَیْرِ الدِّیْنِ وَاَطَاعَ الرَّجُلُ امْرَأَتَهٗ وَعَقَّ اُمَّهٗ وَاَدْنٰی صَدِیْقَهٗ وَاَقْصٰی اَبَاهُ وَظَهَرَتِ الْاَصْوَاتُ فِی الْمَسَاجِدِ وَسَادَ الْقَبِیْلَةَ فَاسِقُهُمْ وَکَانَ زَعِیْمُ الْقَوْمِ اَرْذَلَهُمْ وَاُکْرِمَ الرَّجُلُ مَخَافَةَ شَرِّهٖ وَظَهَرَتِ الْقَیْنَاتُ وَالْمَعَازِفُ وَشُرِبَتِ الْخُمُوْرُ وَلَعَنَ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اَوَّلَهَا فَارْتَقِبُوْا عِنْدَ ذٰلِکَ رِیْحًا حَمْرَاءَ وَزَلْزَلَةً وَّخَسْفًا وَّمَسْخًا وَّقَذْفًا وَّاٰیَاتٍ تَتَابَعُ کَنِظَامٍ قُطِعَ سِلْکُهٗ فَتَتَابَعَ۔ رواه الترمذی مشکوٰة صفہ ۴۷

ترجمہ :- ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب مندرجہ ذیل باتیں تم کو نظر آنے لگیں تو پھر اس وقت آفات کا انتظار کرنا چاہئے (۱) سرخ آندھیاں (۲) زلزلے (۳) زمین میں دھنس جانا (۴) اور آدمیوں کی صورتوں کا بگڑ جانا (۵) اور آسمان سے پتھروں کا برسنا، اور ایسے ہی پے در پے عجائبات کا اس تیزی کے ساتھ پیش آنا جیسا کہ کسی ہار کا تاگا ٹوٹ جائے اور اس کے دانے پہ دانے تیزی کے ساتھ گرنے لگیں وہ باتیں یہ ہیں :-

(۱) جبکہ مال غنیمت اپنی ذاتی دولت بنالی جائے (یعنی اس کے مستحقین میں تقسیم نہ کی جائے۔)

(۲) اور امانت کو مفت کی غنیمت سمجھ لیا جائے (یعنی اس کو ادا کرنے کے بجائے اپنے مصارف میں استعمال کر لیا جائے

(۳) اور زکوٰۃ کو تاوان سمجھا جائے (یعنی خوشدلی کی بجائے بکراہت ادا کی جائے)

(۴) اور علم دنیا کے لئے طلب کیا جائے، نہ کہ رضائے حق کے لئے

(۵) اور آدمی بیوی کی فرمانبرداری کرے اور ماں کی نافرمانی

(۶) اور دوست سے محبت و بے تکلفی رکھے اور والد سے تکلف اور نفرت

(۷) اور مسجدوں میں کھلم کھلا شور مچنے لگے

(۸) اور قبیلہ کا سردار وہ مقرر ہو جو ان سب میں فاسق انسان ہو نہ وہ شخص جو متقی اور نیک ہو

(۹) اور قوم کا سردار وہ ہو جو سب سے زیادہ کمینہ خصلت ہو

(۱۰) آدمی کا احترام کیا جائے تو صرف اس کے شر سے بچنے کے لئے نہ اس کی صفاتِ حمیدہ کی وجہ سے

(۱۱) گانے بجانے والی عورتیں گلی گلی پھرنے لگیں

(۱۲) اور شراب نوشی عام ہو جائے

(۱۳) اور اس امت کے آخر لوگ پہلے لوگوں پر لعنت و ملامت کرنے لگیں۔

شرح :- یہ تیرہ باتیں کہ جس وقت ان کا تذکرہ کیا جا رہا تھا اس وقت اس کا کیا وہم و گمان کیا جا سکتا تھا کہ امت محمدیہ کے حکام اور بعض علمار سب اس ناگفتہ بہ نوبت کو پہنچ جائیں گے اب اگر ان میں سے ایک ایک کے متعلق کچھ تفصیل کی جائے اور اس کے اسباب جو اس ناقص درناقص کے ذہن میں کچھ کچھ ہیں ضبط تحریر میں لائے جائیں تو پھر اس کے لئے ایک دفتر درکار ہوگا اگر کسی کے سینہ میں دل اور دل میں ایمان کی کچھ روشنی ہوگی تو اس روشنی میں جتنا دیکھ سکتا ہے خود دیکھ لیگا' ان شاء اللہ تعالیٰ مختصر کرتے کرتے یہ رسالہ یونہی بہت

طویل ہو گیا، اللہ تعالیٰ یہ بھی قبول فرمائے تو یہ بھی کافی ہے۔

شریعت اسلام میں کسی مسلمان یا کسی کافر رعیت کا ناحق قتل کرنا بھی کفر کے ہم پلہ گناہ شمار ہوتا ہے

(۵۷) عَنِ ابْنِ عُمَرَؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَنْ یَّزَالَ الْمُؤْمِنُ فِیْ فُسْحَۃٍ مِّنْ دِیْنِہٖ مَا لَمْ یُصِبْ دَمًا حَرَامًا۔ رواہ البخاری وعند ابی داؤد فاذا اصاب دما حراما بلح مشکوٰۃ ص۲۹۹، ص۳۰۱

ترجمہ:۔ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مومن کے لئے دین میں اس وقت تک بڑی وسعت رہتی ہے جب تک کہ وہ کسی کا ناحق خون نہ بہائے (بخاری شریف) اس کے بعد ابوداؤد شریف میں اتنی زیادتی اور ہے کہ جب بدقسمتی سے وہ اس جرم کا ارتکاب کر لیتا ہے تو بس اسی دن سے عمل خیر سے محروم ہوتا چلا جاتا ہے (پھر بخدا ہی کو معلوم ہے کہ گرتے گرتے کس نوبت کو جا پہونچتا ہے)

شرح:۔ مسلمان کا قتل کرنا شرعی نظر میں کوئی معمولی جرم نہیں اسکی اہمیت صرف حدیثوں میں ہی بیان نہیں ہوئی بلکہ قرآن کریم نے

اس کا ان الفاظ میں اعلان فرمایا ہے کہ اس بدترین جرم کا بدلہ تو یہ ہے کہ اس کا مرتکب اسی سزا کا مستحق ہے جس کا کہ ایک کافر۔ یعنی دوزخ کا دائمی عذاب قتلِ مسلم تو درکنار ابن ماجہ میں ابو ہریرہؓ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے اس سلسلہ میں ذرا سا کلمہ کہکر بھی کسی قاتل کی مدد کی تو قیامت کے دن وہ اس طرح حاضر ہوگا کہ اس کی پیشانی پر یہ نقوش لکھے ہوئے ہوں گے۔ "یہ شخص اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم ہے" (مشکوٰۃ شریف ص۳۰۲)

اس حدیث میں ایک عمیق حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ انسانی زندگی میں جب کوئی انقلاب رونما ہوتا ہے تو وہ یکلخت رونما نہیں ہوتا بلکہ جس طرح کہ دن کی روشنی اور شب کی تاریکی تدریجی طور پر آتی ہے اسی طرح اس انقلاب کی رفتار بھی آہستہ آہستہ اس طرح ہوتی ہے کہ خود اس شخص کو بھی احساس نہیں ہوتا کہ وہ کہاں تھا پھر کہاں جا پہنچا ہے اسی طرح قاتل مسلم کا حال ہے کہ اس کی دینی مستعدی روز بروز ایسی رفتار سے مدھم پڑتی چلی جاتی ہے کہ خود اس کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا آخر اس کا دین ایک دن غرق ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور خدا معلوم اس کا شمار پھر کس طرف ہو جاتا ہے، اب یہ رحمت کے رموز ہیں کہ کبھی کبھی اس ڈوبتے کو غیب سے کوئی سہارا ملجاتا ہے کہ وہ پھر وہ

غوطہ کھا کر سطح آب پر آجاتا ہے اور رحمت کشاں کشاں اس کو باہر
لے آتی ہے لیکن یہ سب اتفاقات ہی ہوا کرتے ہیں ورنہ ڈوبا ہوا بھلا
کب باہر آتا ہے، اس لئے ایسی باتوں سے ڈرتے رہنا چاہئے اور
اور خدا تعالیٰ سے ہمہ وقت پناہ ہی مانگنا چاہئے، ہمارے موجودہ
معاشرے میں جہاں دوسری بہیمی صفات راہ پا چکی ہیں ان میں سے
ایک بدترین خصلت ناحق قتل کرنا بھی ہے، ذرا سی بات پر ایک
مسلمان دوسرے مسلمان کو قتل کر ڈالتا ہے کاش کہ وہ یہ بھی
جان لیتا کہ اس نے ایک مسلمان کی دنیا ختم کی ہے لیکن اپنی تو آخرت
برباد کر ڈالی ہے۔ اسی لئے اسلام نے قتل کی سزا "قصاص" مقرر فرمائی
ہے یعنی اگر ایک شخص کسی کی دنیا ختم کرتا ہے تو اس کو یہ سزا ملنی چاہئے
کہ اسکی دنیا بھی ختم کر دی جائے اور بعض ائمہ کے نزدیک تو یہ بھی
لازم ہے کہ اس کو سزائے موت بھی اسی طریقہ سے دینی چاہئے جس
طرح کہ اس نے اس جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ حتیٰ کہ اگر اس نے کسی کا سر
پتھر سے کچلا ہے تو اس کا سر بھی اسی طرح کچل دینا چاہئے، قرآن کہتا ہے
قاتل کو قتل کر دینا یہ بے رحمی نہیں بلکہ دوسرے انسانوں کی زندگی کا راز
اسی سزا کے نفاذ میں مضمر ہے، اس حقیقت کی زیادہ تفصیل کی یہاں
گنجائش نہیں علما جانتے ہیں اور بے علم ان سے معلوم کر سکتے ہیں۔

یہاں مجھکو یہ تنبیہہ کردینی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ دوسرے مذاہب اپنے منہ سے خواہ کچھ ہی دعوی کریں لیکن عملاً ان کے نزدیک خون کی کوئی قیمت ثابت نہیں ہوتی لیکن یہ اسلام ہے کہ اگر کھلا کافر یعنی دشمن اسلام ہماری مملکت میں شرائط کے موافق ہماری پناہ میں رہتا ہے تو اگر کوئی مسلمان اس کو قتل کرے گا تو اس کو جنت کی خوشبو سونگھنی بھی نصیب نہ ہوگی (مشکوۃ شریف) یہ اس وجہ سے کہ کفر اور اسلام میں امتیاز کا دن عالم آخرت ہے لیکن اس دنیا میں اسلام ایک نظام رکھتا ہے اور وہ یہ نہیں چاہتا کہ ان معاملات میں اس عالم میں اپنے نظام میں اپنے دوست و دشمن کے درمیان کوئی امتیاز باقی رکھے' یہ بات ان اوراق میں بار بار آپ کی نظر سے گذرے گی کہ اسلام صرف عارضی اور ظاہری نظام پر بس نہیں کرتا۔ بلکہ وہ ایک دوسرے اندرونی قانون کا دباؤ بھی انسان کے ضمیر پر ڈالتا ہے جو اس کے ماننے والوں کی نظروں میں دنیوی نظام سے زیادہ بلند اور زیادہ اثر انداز ہوتا ہے اس لئے ایک سچا مسلمان اس پر مجبور ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے ظاہری قانون کی پابندی صرف ظاہری حکومت کے ڈر سے نہیں بلکہ اپنے دل و جان سے کرنے پر مجبور ہو اور جب تک اس قسم کا کوئی خوف انسان کے دل پر مستولی نہ رہے اسوقت

تک صرف ظاہری قوانین نظام عالم قائم رکھنے کے لئے ہرگز کافی نہیں ہو سکتے۔

خودکشی کرنے والا مصیبت سے نجات نہیں پاتا بلکہ اپنے اوپر دائمی مصیبت مسلط کر لیتا ہے

(۵۸) عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ تَرَدّٰى مِنْ جَبَلٍ فَقَتَلَ نَفْسَهٗ فَهُوَ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ یَتَرَدّٰى فِیْهَا خَالِدًا مُّخَلَّدًا فِیْهَا اَبَدًا وَّمَنْ تَحَسّٰى سَمًّا فَقَتَلَ نَفْسَهٗ فَسُمُّهٗ فِیْ یَدِهٖ یَتَحَسَّاهُ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُّخَلَّدًا فِیْهَا وَمَنْ قَتَلَ نَفْسَهٗ بِحَدِیْدَةٍ فَحَدِیْدَتُهٗ فِیْ یَدِهٖ یَتَوَجَّاُ بِهَا فِیْ بَطْنِهٖ فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُّخَلَّدًا فِیْهَا اَبَدًا۔ متفق علیہ مشکوٰۃ صفہ ۲۹۹

ترجمہ:- ابوہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص خودکشی کرے گا وہ دوزخ کی آگ میں پڑا ہوا اسی طریقہ پر ہمیشہ ہمیشہ خودکشی کرتا رہے گا اگر پہاڑ سے گر کر اس نے خودکشی کی ہوگی تو وہ ہمیشہ اسی طرح اپنے آپ کو پہاڑ سے گراتا رہے گا اور اگر اس نے زہر کھا کر اپنے آپ کو ہلاک

کیا ہوگا تو وہ اسی طرح ہمیشہ دوزخ کی آگ میں پڑا ہوا اپنی جان کو ہلاک کرتا رہیگا اور اگر اس نے کسی ہتھیار سے اپنے آپ کو قتل کیا ہوگا تو اس کا ہتھیار اسکے ہاتھ میں ہوگا اور وہ ہمیشہ دوزخ کی آگ میں پڑا ہوا اسکو اپنے پیٹ میں گھونپتا رہیگا۔

شرح: ایک آزاد مسلمان خواہ کتنا ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو یہ صرف سنتا ہی سنتا ہے کہ اسکی جان خود اسکی ملکیت نہیں بلکہ جان آفرین کی ملکیت ہے اسیطرح وہ مابعد الموت کی زندگی کو صرف سنتا ہی سنتا ہے مگر نہ اس پر اسکو پورا الیقین حاصل ہوتا ہے اور نہ اسکی تفصیلات سے وہ کچھ آشنا ہوتا ہے اسلئے ذرا سی بات پر وہ خودکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس نے اپنی موجودہ مشکلات سے بڑی آسانی سے رستگاری حاصل کرلی لیکن اگر وہ کچھ مذہب سے بھی آشنا ہوتا تو وہ یہ بھی سوچتا ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے ؛ مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائینگے

اس مسکین کو یہ بھی علم نہیں کہ جس حیات کو اس نے زندگانی سمجھا تھا یہ تو بہر حال فانی تھی اور جس کو اس نے موت تصور کیا تھا درحقیقت وہ دائمی حیات تھی اس لئے اس کی خودکشی سے اس کو نجات نصیب نہیں ہوگی بلکہ اور دائمی مصیبت گلے پڑ جائے گی

حدیث مذکور سے پاداش عمل کے ایک عجیب قانون کا بھی پتہ ملتا ہے جسکو "جزاء من جنس العمل" کہا جاتا ہے یعنی عالم غیب میں

قانون یہ ہے کہ سزا اسی جنس کو ملتی ہے جس جنس کا عمل ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے جس شخص نے اپنی جان کو جس آلہ کے ذریعہ ہلاک کیا ہوگا اس کی سزا بھی یہی ملے گی کہ وہ ہمیشہ اپنی جان کو اسی آلہ سے ہلاک کرتا رہیگا اور ہمیشہ اسی طرح اس کو عذاب ہوتا رہیگا' بے عقل انسان یہ سمجھتا ہے کہ ایک مرتبہ چھری گھونپ کر بس اسکی مصائب کا خاتمہ ہوگیا کاش کہ اس کو یہ علم ویقین بھی حاصل ہوتا کہ آئندہ اسکو نجات کہاں ہمیشہ کے لئے اسی عذاب میں گرفتار رہنا ہے۔

وہ نفوسِ قدسیہ یعنی صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کہ جب سے وہ گم ہوئے دین کا مزہ جاتا رہا

(۵۹) عَنْ اَنَسٍؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّے اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَثَلُ اَصْحَابِیْ فِیْ اُمَّتِیْ کَالْمِلْحِ فِی الطَّعَامِ لَا یَصْلَحُ الطَّعَامُ اِلَّا بِالْمِلْحِ قَالَ الْحَسَنُؒ فَقَدْ ذَھَبَ مِلْحُنَا فَکَیْفَ یَصْلَحُ۔

رواہ فی شرح السنۃ مشکوٰۃ صفحہ ۵۵۴

ترجمہ:۔ انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری تمام امت میں میرے صحابہ کی مثال (یعنی وہ لوگ جنھوں نے مجھکو

ایمان کے ساتھ ایک بار بھی دیکھ لیا ہے، یا ان کو میری صحبت نصیب ہوئی اور اسی حالت پر ان کا خاتمہ ہو گیا، ایسی ہے جیسا نمک کھانے میں کہ جیسے کھانا نمک کے بغیر اچھا اور لذیذ نہیں ہو سکتا اسی طرح میری امت کی اصلاح میرے صحابہ کی اتباع بغیر نہیں ہو سکتی، حسنؓ صحابہ کے دور کے گذرنے پر بڑی حسرت کے انداز میں فرماتے ہیں کہ جب ہمارا نمک ہی ختم ہو گیا تو اب ہمارے دین میں لذت کہاں سے آئے۔

شرح: قرآن کریم میں ارشاد ہے وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ (اور تیرا رب پیدا کرتا ہے جو چاہے، اور پسند کرے جس کو چاہے، ان کے ہاتھ میں نہیں پسند کرنا) (پارہ ۲۰ رکوع ۱۰) خلاصہ یہ ہے کہ تیرے پروردگار کی شان یہ ہے کہ وہ جو چاہے پیدا کرتا ہے اور پھر اسمیں جس کو چاہے انتخاب فرما لیتا ہے، یعنی جس طرح پیدا کرنا یہ خاص اس کی صفت ہے اس میں کوئی اس کا شریک نہیں اسی طرح کسی کا انتخاب فرما لینا یہ بھی اس کی شان ہے اس میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں مثلاً زمین میں اس نے مکہ مکرمہ کو بیت اللہ کے لئے انتخاب فرمایا اور مدینہ طیبہ کو اپنے حبیب پاک کے مدفن ہونے کیلئے انتخاب فرمایا اسی طرح انسانوں میں سے جسکو چاہا اپنی رسالت کیلئے منتخب فرمایا اور رسولوں میں سے جس کو چاہا اپنا حبیب بنانے کا انتخاب فرمایا صلوات اللہ والسلام علیہ

پھر جس طرح اپنے حبیب پاک کی زوجیت کے لئے
صنف نسار میں سے چند عورتوں کا انتخاب فرمایا اسی طرح آنحضرت
سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی صحابیت کے لئے تمام عالم
میں سے چند نفوس قدسیہ کا انتخاب فرمایا یہ سب انتخابات اسی
خدا وحدہٗ لاشریک لہٗ کی صفت اختیار کے ماتحت ہے جس میں
کسی کا کوئی دخل نہیں اور نہ کسی کو اس سے باز پرس کرنے کا کوئی
حق ہے اب آپ سوچ لیجئے کہ جو عالم میں خدائی انتخاب کے ماتحت
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شرف صحبت کے لئے چنے گئے ہوں گے
وہ کیسے قیمتی اور پاک نفوس ہوں گے، لہذا ان کا کیا پوچھنا جو تمام
جہان سے آپ کی فیض صحبت کے لئے منتخب ہوئے خدا کی کتاب
اور خدا کا دین انہیں کے ذریعہ سے دنیا میں پھیلا اور انہیں کے
دم سے یہ دین ہم کو نصیب ہوا۔ وہی قرآن کے سب سے پہلے حامل
تھے اور وہی سب سے پہلے اس پر عمل کرنے والے تھے جنھوں نے
سب سے پہلے دین کے لئے اپنا وطن چھوڑا تجارت اور مال و دولت
سے منہ موڑا اور وہی تھے جنھوں نے سب سے پہلے دین کے واسطے
اللہ اور رسول کی محبت میں اپنی گردنیں کٹوائیں اور شوق شوق سے
اپنی بیویوں کو بیوہ بنایا اور اپنے پیارے بچوں کو یتیم بنایا اور

یہ سب کچھ اتنی خوشی سے کیا گویا ان تمام قربانیوں کے لئے ہی وہ پیدا کئے گئے تھے، انہیں کے تذکروں سے قرآن کریم بھرا پڑا ہے اور زمین کا چپہ چپہ ان کی سچی قربانیوں کی گواہی دے رہا ہے تاریخ ان کے زریں کارناموں کو یاد کر کرا کے رو رہی ہے اور زمین آسمان اس کی شہادت پر بے ساختہ گواہی دے رہے ہیں۔

یہ ان کی مدح سرائی نہیں بلکہ حقیقت ہی حقیقت ہے اور وہ حقیقت ہے جس کے اظہار سے قلم درماندہ اور زبان عاجز ہے حسب بیان انجیل حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعض خاص حوارین یعنی صحابیوں نے اپنے رسولِ پاک کے ساتھ غداری کی اور خود انجیلوں کے بیان کے موافق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی گرفتاری میں خاص حصہ لیا لیکن خدا کے اس آخری پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام علیہ کے صحابۂ کرام نے ایک موقع پر بڑے جوش وخروش کے ساتھ یہ جواب دیا کہ اے خدا کے پیارے رسول ہم وہ نہیں جو اصحابِ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرح یہ کہہ دیں کہ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قَاعِدُوْنَ (سو تو جا اور تیرا رب اور تم دونوں لڑو ہم تو یہیں بیٹھے ہیں) (پارہ ۶ رکوع ۸) یعنی اے موسیٰ بس تو اور تیرا رب جا کر ہمارے دشمنوں سے لڑ اور ہم تو

یہاں بیٹھے ہوئے ہیں، یارسول اللہ ہم وہ ہیں کہ اگر آپ ہمکو حکم دیں گے تو ہم بلا کسی پس وپیش کے اسی دم اپنے گھوڑوں کو سمندر میں ڈال دیں گے ؎

آں نہ من باشم کہ روز جنگ بینی پشت من
آں منم کاندر میانِ خاک وخوں بینی سرے

یہ صرف ان کے زبانی دعوے نہ تھے بلکہ ہر موقع پر مدت العمر اپنے اعمال اور اقوال سے اس کا ثبوت دیتے رہے، مجھ کو یہاں صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی زندگی کا صحیح نقشہ کھینچنا منظور نہیں اور نہ میرے قلم میں اسکی اہلیت اور لیاقت ہی، یہ چند سطور اس رسالہ کے آخر میں صرف تبرکاً درج کرنے پر مجبور ہوں کیونکہ انہیں کے طفیل میں آج میرا شمار مسلمانوں کی قطار میں ہے، سورہ فتح کے آخر میں انکا نقشہ جس انداز میں کھینچا گیا ہے اس کو لکھے بغیر قلم نہیں رکتا:۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ۔

(محمد رسول ہے اللہ کا اور جو لوگ اسکے ساتھ ہیں زور آور ہیں کافروں پر نرم دل ہیں آپس میں) (پارہ ۲۶ رکوع ۱۲) کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالےٰ کے سچے رسول ہیں اور انکی صداقت کا

بدیہی ثبوت وہ نفوس ہیں جو ہمہ وقت ان کے گرد و پیش
ان کی صحبت میں رہتے ہیں کیونکہ یہ ایک قاعدہ ہے کہ انسان
کی اُولوالعزمی اور بلندی پہچاننے کا معیار اُس کے رُفقاء و
ہمنشین یعنی اُس کی سوسائٹی ہوتی ہے، یہاں آپ کے فیضِ صحبت یافتہ
نفوس کے جن چیدہ صفات کا تذکرہ کیا گیا ہے ان میں سے
چند یہ ہیں کہ وہ باہم تو بہت نرم دل اور ہمدرد ہیں لیکن دشمنِ خدا
اور رسول کے مقابلہ میں بڑے سخت اور کڑوے، انکی عبادتِ الٰہی
کا نقشہ دیکھنا چاہو تو اس طرح دیکھو گے گویا وہ ہمہ وقت
نمازوں میں سربسجود ہیں، پھر نیت کے اتنے بلند کہ دنیوی کسی
طمع کا ان کے دلوں میں نام نہیں، صرف ایک رضائے الٰہی
اور اسکے فضل کے متلاشی نظر آئیں گے ؎

آں نمی خواہم کہ گردد قصرِ جنت جائے من
وائے بر من گر نشد راضی زمن مولائے من

اِس شعر میں گویا ان ہی کی کیفیت کی حکایت ہے،
نمازوں کی پابندی خصوصاً تہجد کی نماز سے اُن کے چہروں
پر خاص قسم کا نور اور رونق ہے، گویا خشیت و خضوع اور
حسنِ نیت و اخلاص کی شعاعیں باطن سے پھوٹ پھوٹ کر

ظاہر کو روشن کر رہی ہیں، حضرت کے اصحاب اپنے چہروں کے نُور
اور متقیانہ چال ڈھال سے لوگوں میں الگ پہچانے جاتے
تھے۔ پہلی کتابوں میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں
کی ایسی ہی شان بیان کی گئی تھی، چنانچہ بہت سے غیر متعصب
اہلِ کتاب اُن کے چہرے اور طور و طریق دیکھ کر بول اٹھتے تھے
کہ واللہ یہ تو مسیح کے حواری معلوم ہوتے ہیں، قرآنِ کریم میں
صحابہ کی مثال ان آیات میں کھیتی کی سی بیان کی گئی ہے کہ
جب دانہ پھٹ کر زمین سے باہر نکل آتا ہے تو وہ اس کمزور
حالت میں ہوتی ہے کہ ذرا سی لُو لگے تو خشک ہو کر رہ جائے
لیکن رفتہ رفتہ قدرت اس کو اتنا مضبوط اور قوی بنا دیتی
ہے کہ وہ لمبی لمبی شاخوں پر خود کھڑی ہو کر لہلہاتی ہوئی نظر
آنے لگتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ صحابۂ کرام کی یہ بڑھتی ہوئی شان
دیکھ کر جو کافر ہیں وہ جلے مرتے ہیں کہ یہ مٹھی بھر کمزور مسلمان
ذرا سی مدت میں اس قابل کیوں ہو گئے کہ وہ خود اپنے پیروں
پر کھڑے ہو کر اتنے مضبوط ہو گئے کہ مخالفین ان کا بال بیکا
بھی نہیں کر سکتے، حضرت شاہ عبد القادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ
فوائد میں لکھتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں

کوئی ایک دو فرد داخل ہوئے پھران کی تعداد بڑھتی گئی اور بڑھتے بڑھتے فوج در فوج لشکر در لشکر بن گئے اور آخرکار تمام عالم پر غالب آگئے، صحابہ کی شانِ رحمت و غلظت کے متعلق تشریح فرماتے ہوئے لکھتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ صفات انسان میں بھی ہوتی ہیں لیکن فطری صفات کا ظہور اچھے اور بُرے محل کی تمیز نہیں کرتا یعنی جو رحم دل ہے وہ ہر جگہ رحم دل ہے اور جو کڑوے مزاج کا ہے وہ ہر جگہ کڑوے مزاج کا رہتا ہے، لیکن جب یہ صفتیں ایمان سے پھوٹ کر نکلتی ہیں تو پھران کے ظہور کا محل علیحدہ علیحدہ ہو جاتا ہے یعنی نرمی اس جگہ ہوتی ہے جہاں نرمی چاہیئے اور سختی اس محل پر ہوتی ہے جہاں اسکی ضرورت ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ کسی کافر کے ساتھ احسان اور حسنِ سلوک سے پیش آنا اگر مصلحتِ شرعی ہو، کچھ مضائقہ نہیں، مگر دین کے معاملہ میں وہ تم کو ڈھیلا نہ سمجھے۔

صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے مناقب میں یوں تو صحیح حدیثوں کے انبار لگے ہوئے ہیں لیکن جس حدیث کو یہاں میں نے انتخاب کیا ہے وہ صرف اسلئے انتخاب کیا ہے کہ اپنے دورِ شباب میں جب کبھی میں نے انجیل کا مطالعہ

کیا تھا تو ہر چند کہ وہ محرف ہو چکی ہے لیکن اس کا ایک فقرہ اتنا مؤثر ہے کہ اُس کا اثر آج تک میرے دل میں تازہ محسوس ہوتا ہے، اِس وقت اُس کا جو مضمون میرے دماغ میں ہے اُسکے الفاظ قریب قریب یہ ہیں، حضرت عیسٰی علیہ السلام بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں "دیکھو تم دنیا کے نمک ہو لیکن اگر نمک کا مزہ جاتا رہے تو پھر وہ کس چیز سے نمکین کیا جائے گا۔"

یہی مضمون آپ کے سامنے آنحضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے صحابہ کے متعلق ہے، آپ فرماتے ہیں کہ میرے صحابہ سے دین کی رونق اور دین کا مزہ اسی طرح ہے کہ جیسے کھانے کا مزہ نمک سے مگر یہ وہ نمک نہ تھے جن کا مزہ جاتا رہتا بلکہ جب تک وہ دنیا میں موجود رہے دین اور دُنیا ان کے وجود سے لطف اندوز ہوتے رہے اور جب وہ گذر گئے راوی اُن کو حسرت سے یاد کر کے اُن کا نوحہ ان الفاظ میں کر رہا ہے کہ ہائے جب ہمارا نمک ہی باقی نہ رہا تو ہمارے دِین میں مزہ کیا باقی رہے گا، صحیح مسلم میں ابو بردہؓ اپنے والدِ ماجد سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے

سرِ مبارک کو آسمان کی طرف اٹھا کر فرمایا اور آپ کی اکثر عادتِ مُبارکہ یہی تھی کہ (وحی کے انتظار میں) آسمان کی طرف نظر اٹھایا کرتے تھے، ارشاد فرمایا کہ ستارے جب تک جگمگا رہے ہیں اُس وقت تک آسمان پاش پاش ہونے سے محفوظ ہے اور جب ستارے ٹوٹ کر گر جائیں تو اس کے بعد آسمان کی خیر نہیں، اسی طرح میں اپنے صحابہ کے لئے ہر آفت سے ایک سپر ہُوں اور جہاں میں دنیا سے رخصت ہوا تو میرے صحابہ کی خیر نہیں اور اسی طرح میرے صحابہ کا وجود میری ساری امت کے لئے باعثِ حفظ وامن ہے اور جب میرے صحابہ کا دور ختم ہو جائے گا تو میری امت کی خیر نہیں۔ (مشکوٰۃ شریف صفحہ ۵۵۳) اس حدیث کی کچھ تشریح جواہر الحکم حصہ دوم کے مطالعہ سے واضح ہو سکتی ہے وہاں مُلاحظہ کر لی جائے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کا کچھ مجمل نقشہ رزین کی روایت میں مذکور ہے، اس سے ان کی صفاتِ عالیہ کا کچھ اندازہ لگایا جا سکتا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ جب کسی کو کوئی

صحیح طریقہ اختیار کرنا ہو تو وہ ان صحابہ کا طریقہ اختیار کرے جو خطرناک فتنوں سے محفوظ ہو کر دنیا سے گذر گئے اور ہم میں سے جو زندہ ہے اس کے متعلق نہیں کہا جا سکتا کہ وہ فتنوں کے چکر میں پڑ کر کدھر نکلیں گے، خوب یاد رکھو کہ وہ لوگ جو آنحضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے مشرف ہوئے وہ اس تمام اُمت میں سب سے افضل تھے، ان کے قلوب نیکی اور تقویٰ میں سب سے بڑھ کر، ان کا علم سب سے زیادہ گہرا، نہایت بے تکلّف اور یہ فضیلت انکے لئے کم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے سب سے افضل رسُول کی رفاقت کے لئے پسند کیا اور ان کے ذریعہ سے اپنا پسندیدہ دِین دنیا میں صحیح طور پر پھیلایا، لہٰذا یہ تمہارا فرض ہے کہ تم بھی ان کی اس فضیلت کو پہچانو اور ان کے نقشِ قدم پر چلتے رہو اور جہاں تک ممکن ہو ان کی ایک ایک عادت اور اخلاق کو اختیار کرو کیونکہ وہ بلاشبہ ہدایت کی سیدھی راہ پر قائم تھے۔ (مشکوٰۃ شریف صفحہ ۳۲)

اس حدیث میں صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کی جو صفات بیان کی گئی ہیں اس مختصر رسالہ میں ان کی تشریح کی

گنجائش نہیں دیکھنے میں وہ معمولی نظر آتی ہیں لیکن ایک
صحیح الفہم شخص کے لئے وہ ایک ایسا گہرا سمندر ہے جس کی
تہ تک پہنچنا مشکل ہے، اگر طاقت اور فرصت میرا ساتھ دیتی
تو اپنی چھوٹی سی حیثیت کے مطابق مَیں بھی کچھ لکھتا، اب
یہ اہلِ قلم کے سپرد ہے کہ وہ ایک ایک صفت کو پھیلا کر
دنیا کو یہ بتا دیں کہ یہ صفت ان میں کس درجہ کی تھی اور تمام
دنیا کو جو حصہ اس میں سے مِلا ہے وہ کتنا ہے اور اہلِ ایمان
سے یہ درخواست ہے کہ وہ باریک بینی اور موشگافیوں سے
قطع نظر کر کے ان صفات میں سے اگر کوئی ذرہ اپنی زندگی
میں پیدا کر سکتے ہیں تو اس کی کوشش کریں، یعنی دل میں
تقویٰ اور نیکی، علم میں طول و عرض اور پھیلاؤ کے بجائے
اختصار مگر گہرائی، تصنّع اور تکلّف سے احتراز اور اگر آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت سے مایوسی ہے تو اس کی
بجائے آپ کی ایک ایک سنّت کا دل و جان سے والہانہ جنون.
شاید ان صفات کی کوئی جھلک ہم میں پیدا کر دے تو
جس ربّ العزت نے اپنی تمام مخلوق میں سے صحابۂ کرام کو
پہلے چُنا تھا وہ آخرِ اُمت میں سے ہم ناقص در ناقص اور

نالائق اُمتیوں کو اس شرف کے لئے چُن لے۔

وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْز

اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوْنَ وَسَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ ○